ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

۱۰/ جنوری ۱۹۹۵ء

☆ سقوط ڈھاکہ کا منظر و پس منظر: ایک عینی شاہد کا بیان

☆ رباط کانفرنس جیسی تقاریب کی حیثیت اب ہے کیا؟

☆ ہمارے سُنّی بھائی تو بالکل ہی "سُنّ" ہو کر رہ گئے ہیں

حدیثِ امروز

وقتِ فرصت ہے کہاں، کام ابھی باقی ہے

سوویت یونین کے انہدام کے بعد دوسری متعدد چھوٹی ریاستوں کی طرح آزاد ہو جانے والی سب سے بڑی ریاست روس، زار روس کے استعمار کی وارث ہے جس نے اٹھارویں صدی عیسوی کے دوران بحر اسود کے مشرق میں واقع قفقاز کے کئی مسلم علاقوں کو بھی نگل لیا تھا۔ ان میں زار شاہی کو تیس برسوں پر محیط طویل ترین مزاحمت سے امام شامل نے دوچار کیا جس کے دم توڑ جانے پر ڈھائی تین لاکھ چیچن مسلمانوں کو بھی غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈالنا پڑ گیا تھا۔ یہ اسی دور کی بات ہے جب امت مسلمہ زوال کی آخری انتہا کو پہنچ رہی تھی اور لاکھوں چھوٹے کروڑوں کی آبادیاں رکھنے والے مسلمان ممالک بھی مجبور ہو گئے تھے کہ اپنی آزادی کی دولت خاموشی سے لٹتے دیکھیں۔ پھر اس کے بعد ستاروں میں روشنی نہ رہی، اور ان مسلمانوں کی شبِ تار تقریباً پورے عالمِ اسلام پر طلوعِ سحر کے بعد بھی ختم نہ ہوئی جو اس نامسعود دورِ زوال میں کمیونزم کے شکنجے میں جکڑے جا چکے تھے۔ یوگوسلاویہ میں کمیونزم کے کریا کرم کے بعد ہی بوسنیا ہرگز یگوینا کی مسلمان آبادی کو پیغام سجود یاد آسکا اور کرۂ ارض پر بسنے والے سوا ارب مسلمان دم سادھے دیکھ رہے ہیں کہ گزشتہ ڈھائی تین سال میں انہوں نے اپنی شناخت بحال کرانے کے لئے قربانی و جاں فروشی کی ایک لازوال داستاں رقم کی ہے۔ اب چیچنیا کے مسلمان ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے روس سے گلو خلاصی کی غرض سے دیوانہ وار و سربکف میدان میں نکل آئے ہیں اور کس شان سے!۔ بھلا سوچئے تو، چند لاکھ نفوس پر مشتمل ایک ذیلی ریاست بھی روس جیسے عظیم الجثہ اور کثیر الوسائل ملک سے مقابلے کے جنون میں مبتلا ہو سکتی ہے؟۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ!۔

یہ ذکر ایک خاص حوالے سے ہے ورنہ ہمارا ماضی تو کیا، حال بھی جذبے کی فراوانی سے مزین اور خونِ شہدا کی خوشبو سے مہک رہا ہے۔ معاصر تاریخ کو افغانیوں اور کشمیریوں نے جو لہو رنگ دیا وہ مٹتے مٹتے بھی انمٹ اثرات چھوڑ جائے گا۔ الجزائر میں "اسلامی بنیاد پرستی" پر آج بھی جانیں نچھاور کی جا رہی ہیں اور مصر میں الجماعۃ الاسلامیہ کے سرفروش موت کی سزا کو مسکراتے ہوئے قبول کرتے اور پھانسی کے پھندے کو چوم کر گلے میں ڈالتے ہیں۔ اسلام کے نام پر سینے کھول کر گولیوں کی باڑھ کے سامنے آ جانے والوں کی پاکستان میں بھی کمی نہیں، یہ منظر یہاں کئی مواقع پر دیکھنے میں آیا اور کوئی ہمت والا اٹھے تو اس کا "ایکشن ری پلے" پھر بھی سامنے لا سکتا ہے لیکن اس سب کے باوجود اسلام اب تک غریب الوطن ہے، اسے کوئی دیس تاحال میسر نہیں آسکا اور دین اپنے غلبہ کا آج بھی منتظر ہے تو کیوں؟۔ یعنی دین کا نام لینے والوں کو تمکن فی الارض میسر نہیں آ رہا تو اس کی وجہ کیا ہے؟۔ اس سوال کا جواب کسی فلسفیانہ موشگافی کا طالب نہیں، سیدھی سی بات ہے کہ منزل کا تعین تو درست کر لیا جائے لیکن اس تک پہنچنے کے لئے راہ راست کا انتخاب نہ ہو سکے تو جادہ پیمائی بھی ہوتی ہے، نبرد عشق میں پاؤں زخمی بھی ہوتے ہیں اور راہ کے سنگ ریزے اور خار زار خون کا خراج بھی وصول کر لیتے ہیں مگر ہدف تک رسائی نہیں ہوتی۔

محمد رسول اللہ والذین معہ (صلی اللہ علیہ وسلم ورضی اللہ عنہم) نے دین کو اس کی پوری شان کے ساتھ غالب اور دینداروں کو پوری آن بان سے سرافراز کرنے کی منزل سر کر کے دکھائی جس کی جاں گسل جدوجہد کے دوران کتاب الہدیٰ،

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

قیمت: ۶ روپے

الھدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہ تم سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟

(کہ اس سورۃ میں چونکہ شروع ہی سے انفاق اور زکوٰۃ کا حکم بار بار آیا ہے اور بالخصوص بیت اللہ کو مشرکین کے تسلط سے آزاد کرانے کے لئے جہاد و قتال کے تاکیدی حکم کے ساتھ ساتھ انفاق پر خصوصی زور دیا گیا ہے لہٰذا بعض مسلمانوں نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ اللہ کی راہ میں کیا اور کتنا خرچ کریں۔ واضح رہے کہ سچے اور پکے مسلمان تو ہر دم اللہ اور رسول کے ہر حکم پر عمل کرنے اور ہر پکار پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے تھے اور ان کی طرف سے اس نوع کے سوالات کم ہی کئے جاتے تھے' ایسے سوالات بالعموم وہ لوگ کرتے تھے جو جان و مال کی قربانی کے معاملے میں کمزور تھے اور اپنی اس کمزوری کو سوالات کے پردے میں چھپانا چاہتے تھے!)

سورۃ البقرہ
(آیت ۲۱۵' ۲۱۶)

کہہ دو کہ جو کچھ مال تم خرچ کرتے ہو وہ ماں باپ کے لئے ہے' اور قرابت داروں کے لئے' اور یتیموں کے لئے' اور محتاجوں کے لئے اور مسافروں کے لئے۔ اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے○

(کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو یہ بات واضح طور پر سمجھ لینی چاہئے کہ جو کچھ بھی وہ خرچ کرتے ہیں اس میں سے کوئی شے کہیں اللہ کے ذاتی خزانے میں نہیں جاتی' وہ ہرگز کسی کے مالی تعاون کا محتاج نہیں ہے' بلکہ یہ سب کچھ ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے۔ ہمارے اپنے ماں باپ اور عزیز رشتہ دار اور ہمارے ہی معاشرے کے یتیم' محتاج اور مسافر اس انفاق سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان میں سے جو ضرورت مند ہیں وہ درجہ بدرجہ اس انفاق اور زکوٰۃ و صدقات کے مستحق ہیں۔ گویا اللہ کی راہ میں جو کچھ ہم خرچ کرتے ہیں وہ کسی دوسرے کی خدمت پر نہیں' اپنی ہی خدمت پر خرچ کرتے ہیں ---- اور ان خرچ کرنے والوں کو اس بارے میں بھی مطمئن رہنا چاہئے کہ جو کار خیر وہ کر رہے ہیں وہ خواہ کسی چھوٹی نیکی کی صورت میں ہو یا بڑی نیکی کی شکل میں' اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ اللہ کے اس علم کامل کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کوئی نیک عمل ضائع نہیں جائے گا اور انسان کو اس کا بھرپور صلہ مل کر رہے گا!)

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

جنگ کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تمہارے لئے ایک ناگوار شے ہے'

(کہ مالی قربانی کے ساتھ ساتھ دین کے غلبہ و اقامت کے لئے جان کی قربانی بھی درکار ہے۔ اور اگرچہ ایک دور میں مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں تھی لیکن اب ہجرت کے بعد مسلمانوں کی جمعیت اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ کفر کی قوت کو کچلنے اور بیت اللہ کو مشرکین کے تسلط آزاد کر کے جزیرۂ نمائے عرب میں دین حق کو غالب کرنے کے لئے کھلے میدان میں کفار سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے' لہٰذا کفار سے جنگ کرنا اس مرحلے پر فرض کر دیا گیا۔ اور خواہ بعض لوگوں کو جنگ کرنا طبعاً پسند نہ ہو اور وہ اسے ناگوار جانتے ہوں' بہرصورت مسلمانوں کے اجتماعی مفاد اور دین کے مجموعی مصالح کے پیش نظر قتال اب سب مسلمانوں پر فرض کر دیا گیا ہے!)

ممکن ہے تم کسی شے کو ناگوار خیال کرو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہو' اور ممکن ہے کہ تم کسی شے کو پسندیدہ سمجھو حالانکہ وہ تمہارے حق میں بری ہو' اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے○

(کہ انسان کا علم چونکہ ناقص ہے اور وہ عام طور پر اس بات سے ناواقف ہوتا ہے کہ اس کے لئے فوز و فلاح کا حصول کیسے اور عروج و کمال تک رسائی کن ذرائع سے ممکن ہو سکتی ہے لہٰذا بسا اوقات شریعت کے بعض احکام کی حکمت و مصلحت اس پر آشکارا نہیں ہوتی اور ان احکام پر عمل کرنا اس کو ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کی نفسانی خواہشات کا جھکاؤ چونکہ پستی کی طرف ہوتا ہے لہٰذا بسا اوقات وہ کسی ایسی شے کی خواہش کرنے لگتا ہے جو انجام کار اس کے لئے خیر نہیں' شر کا موجب بننے والی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ ہماری مصلحتوں سے ہم سے بڑھ کر واقف ہے اور ہم اس باب میں بالکل کورے!)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

جلد ۴ شمارہ ۲
۱۰/ جنوری ۱۹۹۴ء

1

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تحریکِ خلافت پاکستان
۴ اے مزنگ روڈ۔ لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ، لاہور

قیمت فی پرچہ: -/۶ روپے
سالانہ زرِ تعاون (اندرون پاکستان) -/۱۲۵ روپے

زرِ تعاون برائے بیرون پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ——— ۱۳۰ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ——— ۱۰۰ "
افریقہ، ایشیا، یورپ ——— ۱۶۰ "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ——— ۲۰۰ "

اداریہ

کراچی: ایک مخمصہ اور اس کا حل

اس واقعہ کو اب دس برس ہونے کو آتے ہیں کہ امن کی فاختہ بہ حسرت و یاس کراچی کو خیرباد کہہ گئی جس کے بعد سے "منی پاکستان" کہلانے والا ملک کا یہ سب سے بڑا شہر، واحد بندرگاہ اور اہم ترین تجارتی مرکز اضطراب کی کم و بیش لیکن پے در پے لہروں کی زد میں ہے اور لیپاپوتی کی کوئی کوشش اس کے زخموں پر مرہم نہیں رکھ سکی۔ اس کیفیت کو پیدا کرنے والے عوامل پر تو کچھ زیادہ اختلاف نہیں البتہ ان عوامل کے اسباب پر بھی متضاد آراء پائی جاتی ہیں اور اس بارے میں بھی ہر گروہ اپنا الگ نقطہ نظر رکھتا ہے کہ مرحوم صدر ضیاء الحق کے دور سے لے کر آج تک ملک کے اقتدار پر قابض رہنے والی قوتوں میں سے ہر ایک کا کراچی کے امن کو بھسم کر دینے والی آگ کو سلگانے اور پھر شعلوں میں تبدیل کر دینے میں کتنا حصہ ہے۔ یہ بحث چھیڑ دی جائے تو اسے سمیٹنا اتنا ہی مشکل ہو گا جتنا ۱۹۷۱ء میں ملک کے دولخت ہونے کے سانحے کے اسباب پر بحث کو سمیٹنا دشوار ثابت ہوا' آج تک جس پر اسرار کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ ہماری قوم کا غیر دانشمندانہ طرزِ عمل یہ ہے کہ مناسب وقت پر تو زمینی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر کے موہوم امیدوں اور ہوائی خواہشوں کو واقعات کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور وقت گزر جانے یا کسی حادثے کے ظہور پذیر ہو جانے کے بعد اس کا معروضی تجزیہ بھی حقیقت پسندی سے نہیں کیا جاتا کہ کم از کم مستقبل میں ہی ماضی کے ان اچھے برے تجربات سے استفادہ کیا جا سکے۔

بنا بریں ہم اپنی بات کا آغاز ہی یہاں سے کر رہے ہیں کہ کراچی کے مسائل کا کوئی "ایڈہاک" حل اب ہرگز موثر نہ ہو سکے گا کیونکہ عام شہریوں کو بالخصوص روزگار، تعلیم اور ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں درپیش پریشانیوں کا مداوا آسان نہیں رہا جبکہ وہاں بالفعل کارفرما قوتوں کو موجودہ سیاسی انتظام پر مطمئن رکھنا بھی ہرگز ممکن نظر نہیں آتا جو شہر کی آبادی کی نمائندگی کا واضح اور مکمل اعزاز رکھنے کے باوجود حکومت سے بالکل باہر ہیں۔ مسلسل نظر انداز کئے جانے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بھرپور احساس محرومی نے وہاں عوام و خواص کی سوچ میں جو تلخی بھر دی ہے اس کا موازنہ مرحوم مشرقی پاکستان میں اپنے بنگالی بھائیوں کی سوچ سے کیا جائے تو عبرتناک مماثلت دیکھنے میں آتی ہے۔ اس تناظر میں جب ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اہل کراچی اب علیحدگی کی باتیں سرگوشیوں میں ہی نہیں' برسرِعام بھی کرنے لگے ہیں تو اسے ایک بے بنیاد افواہ قرار دے کر ہم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ جناح پور یا کسی بھی نام سے ہانگ کانگ یا سنگاپور جیسی کسی خود مختار شہری ریاست کا منصوبہ کراچی والوں کے دکھ درد کا مداوا بن سکے گا یا نہیں' نیو ورلڈ آرڈر اور بھارتی عزائم کی تکمیل میں یقیناً ممد و معاون ثابت ہو گا۔

یہ پس منظر ہے تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت کی طرف سے حکومت اور ان قوتوں سے اس مطالبے کا جن کے ہاتھوں میں آج ملک کی تقدیر ہے کہ ایم کیو ایم کو بے مقصد مذاکرات میں الجھا کر قیمتی وقت ضائع کرنے کی بجائے نوشتہ دیوار کو پڑھنے کی سنجیدہ کوشش کی جائے۔ علیحدگی پسندی کا قلع قمع کرنے اور ملک خداداد کو مزید شکست و ریخت سے بچانے کا مجلس کی رائے میں واحد طریقہ یہ رہ گیا ہے کہ اہل کراچی کو اپنے مسائل خود حل کرنے کے مواقع اور ان کے لئے ضروری وسائل فراہم کئے جائیں جس کے بعد وہ اپنی قسمت پاکستان سے وابستہ رکھنے میں ہی مصلحت دیکھیں گے اور ظاہر ہے کہ اس کا مطلب مہاجرین کو ایک علیحدہ صوبہ دینا ہے جو وفاق پاکستان کا حصہ رہ کر بھی حسب منشا ترقی کے لامحدود امکانات رکھتا ہو گا۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہ قصہ کراچی کے بلدیاتی اداروں کو مناسب انتظامی اختیارات اور حسب ضرورت مالی وسائل دے کر مقامی آبادی کے حوالے کر دینے سے کوتاہ کیا جا سکتا تھا لیکن اس کا وقت گزر چکا ہے چنانچہ علیحدہ صوبے سے کم کوئی نسخہ اب کارگر نہ ہو گا۔

مہاجرین کے لئے ایک الگ صوبے کی تشکیل کا مطلب سندھ کی تقسیم ہے جو پرانے سندھیوں کے لئے ایک ایسی کڑوی گولی ثابت ہو گی جسے نگلنا شاید ان کے لئے تو زیادہ مشکل نہ ہو لیکن ان کی سیاسی قیادت کے حلق سے اترنی ہرگز آسان نہیں۔ البتہ اگر چاروں صوبوں کو چھوٹے یونٹوں میں تقسیم کرنے کے لئے نئی حد بندیاں طے کر لی جائیں تو پھر اس مخمصہ

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

سقوطِ ڈھاکہ کا منظر و پس منظر: ایک عینی شاہد کا بیان

بھارتی فوج کا بریگیڈئر ڈھاکہ میں رکشا چلاتا رہا

ہم نے مشرقی پاکستان کے انجام سے بھی کوئی سبق نہ سیکھا

مرتبہ: نعیم اختر عدنان

بھٹو اور فوج کو اس سانحہ کا ذمہ دار قرار دینا ایک سطحی سی بات ہے: میجر جنرل (ر) ایم ایچ انصاری

۱۶/ دسمبر کی شام کو لاہور میں سقوط ڈھاکہ پر ماتم کے لئے برپا ہونے والی واحد مجلس تنظیم اسلامی کے تحت جناح ہال میں منعقد ہوئی لیکن وہاں زیادہ زور اظہار افسوس پر نہیں بلکہ تجزیے اور سبق آموزی پر رہا۔ پہلے مقرر میجر جنرل (ر) ایم ایچ انصاری تھے جو مشرقی پاکستان کی خونچکاں داستان سناتے ہوئے خود بھی روئے اور حاضرین کو بھی رلایا جبکہ دوسرے مقرر امیر تنظیم اسلامی' ڈاکٹر اسرار احمد تھے جنہوں نے اس سانحہ کے اسباب شمار کرائے' بتایا کہ ایسے حادثے آئندہ بھی رونما ہو سکتے ہیں اور ان سے بچنے کا طریقہ بھی بیان کیا--- جنرل انصاری کی تقریر کا خلاصہ ذیل میں دیا جا رہا ہے جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد کی تقریر کے لئے قارئین جنوری ۹۵ء کا "میثاق" ملاحظہ فرمائیں----- ادارہ

خطبۂ مسنونہ اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد فرمایا: میں اپنے موضوع کا تعین ان الفاظ میں کر سکتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کا سانحہ کیوں رونما ہوا یا مشرقی پاکستان ہم سے کیسے جدا ہوا؟ یا مشرقی پاکستان ہم نے کیوں کھویا؟۔ اللہ رب العزت نے انسان کو جو شعور عطا فرمایا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے ماضی کے تجربات کی روشنی میں اپنے حال پر کڑی نظر رکھے اور اس کی مسلسل نگرانی کرتا رہے۔ اپنے معاملات کی اصلاح و درستگی کرتا رہے تاکہ اسے خوشحالی نصیب ہو اور اس کا اچھا حال بہتر مستقبل کی ضمانت دے۔ اسی لئے دین اسلام نے جس قدر زور تدبر و تفکر' سوچ و بچار اور غور و فکر کرنے پر ــــ دیا ہے کسی اور مذہب اور ازم نے نہیں دیا۔ قرآن کریم میں گزری ہوئی اقوام کے حالات بڑی تفصیل اور وضاحت سے بیان کئے گئے ہیں۔ ان کے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان گزری ہوئی اقوام کے حالات اور ان کے انجام سے عبرت حاصل کرے' جو غلطیاں ان سے سرزد ہوئیں ان سے گریز کرے تاکہ اس کی زندگی اچھے طریقے سے بسر ہو سکے۔ قرآن میں کئی مقامات پر اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ "اے نبی آپ ان لوگوں سے کہئے کہ گھومو پھرو اس کرۂ ارضی پر اور دیکھو مجرم قوموں کا کیا انجام ہوا' جنہوں نے دین حق کو جھٹلایا۔ قرآن مجید کی ایک آیت ہمارے موجودہ ملکی اور بین الاقوامی حالات پر بالکل فٹ بیٹھتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے "ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس" یعنی خشکی اور تری پر' زمین اور سمندروں میں ہر جگہ فساد پھیل گیا ہے' یہ فساد انسانوں کے اپنے کرتوتوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے رونما ہوا ہے جس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے بعض اعمال کی سزا انہیں اسی دنیا میں دے دیتا ہے۔ فرمایا گیا "لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون" اسی پکڑ سے شاید ان کو عقل آجائے اور یہ لوگ اپنے رویئے میں اصلاح کر کے بھلائی اور راستی کی طرف لوٹ آئیں۔ ایک دوسرے مقام پر (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے) فرمایا گیا۔ "قل سیروا فی الارض فکیف کان عاقبۃ الذین من قبل" اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے کہئے' اس کرۂ ارضی پر گھومو پھرو اور دیکھو اس سے پہلے (نافرمان) لوگوں کا کیا انجام ہوا۔ قرآن مجید میں جس قدر سابقہ اقوام سے عبرت حاصل کرنے کی ترغیب اور تلقین و نصیحت کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود اپنے حالات پر غور و فکر کرنا کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ اللہ رب العزت نے اپنی آخری کتاب میں سوچنے اور غور کرنے کے بارے میں سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ فرمایا گیا۔ "کذلک یبین اللہ لکم الیاتہ لعلکم تتفکرون فی الدنیا والاخرہ" اللہ تعالیٰ اپنی آیات' اپنی نشانیاں اور اپنے احکام (کھول کھول) کر وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ شاید لوگ اپنے معاملات پر غور و فکر کرنے کی عادت اپنا لیں اور راہ ہدایت پا لیں' گمراہی اور غلط کاریوں میں پڑ کر بھٹک نہ جائیں۔

آیئے ان آیات و احکامات کی روشنی میں ہم اپنے طرز عمل کا جائزہ لیں۔ کیا ہم نے بھی غور و فکر کی عادت اپنائی ہے؟ کیا ہم نے بھی غور و فکر کرنا سیکھا ہے؟ ہم نے اپنے ماضی کے تجربات کی روشنی میں اپنے حال کو بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس بات پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ اس لئے کہ جہاں ہم ہر سال اپنے دینی' سماجی اور سیاسی اکابرین کے ایام مناتے ہیں' ان مواقع پر ان کی تعریف و تحسین میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور گزرے ہوئے ایام کے حوالے سے بھی مذاکرے منعقد کئے جاتے ہیں' اجلاس ہوتے ہیں اور خصوصی مقالے لکھے جاتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ اس دن کے حوالے سے خصوصی پروگرام مرتب کرتے ہیں اور اخبارات و جرائد ان ایام کے حوالے سے خصوصی ایڈیشن شائع کرتے ہیں۔ ان ایام میں سے ۶ ستمبر کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ہم بڑی باقاعدگی' اہتمام اور خوشی سے یہ دن مناتے ہیں۔ وہ اس لئے کہ اس دن دشمن جو مقاصد حاصل کرنا چاہتا تھا وہ حاصل نہ کر سکا۔ گویا دشمن کے عزائم پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ لیکن چھ ستمبر کی طرح

۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کا دن بھی ہماری قومی تاریخ کا اہم ترین دن ہے۔ ناکامی کا ہی سہی مگر اہم دن تو ہے! ہم نے کبھی سنجیدگی سے اس معاملے پر غور کیا ہے کہ کیوں متحدہ پاکستان کی اکثریت اقلیت سے الگ ہو گئی۔ یہ تو سنا ہے اور بہت جگہ ہوتا ہے کہ کسی ملک کی اقلیت اکثریت سے ناراض ہو کر' ان کے رویئے اور پالیسیوں سے مایوس ہو کر الگ ہونے کا فیصلہ کرے اور اس کے لئے ایجی ٹیشن شروع کر دے۔ یہ ہماری قومی تاریخ کا انوکھا اور منفرد واقعہ ہے کہ ملک کی اکثریت نے اقلیت سے الگ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ رشتہ جس نے ہمیں ایک لڑی میں پرویا ہوا تھا' وہ کیوں ٹوٹا؟ دراصل حقیقت یہ ہے کہ ہماری قومی نفسیات کا انداز اور سٹائل یہ ہے کہ کامیابی میں تو ہر شخص حصے دار بننے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکامی کی ذمہ داری کوئی شخص قبول نہیں کرتا۔ تحریکِ پاکستان ہی کو لیجئے۔ اس حوالے سے بہت سے لوگ واقعات بیان کرتے نہیں تھکتے' ہر شخص یہ بتانے کے لئے کہ اس نے تحریک پاکستان میں کتنا فعال کردار ادا کیا تھا کوئی نہ کوئی کہانی لئے بیٹھا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے قائداعظمؒ کو کیسے کیسے نادر اور گراں قدر مشورے دیئے تھے۔ مطالبہ پاکستان کی تحریک کو مقبول بنانے کے لئے انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ جو لوگ ۱۹۴۷ء کے آس پاس پیدا ہوئے ہیں وہ بھی اپنے آپ کو تحریکِ پاکستان کا کارکن کہلواتے ہیں اور اپنے احسانات گنواتے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ناکامی کی ذمہ داری کا تعلق ہے کوئی اس کے قریب نہیں پھٹکتا۔ ناکامی کے داغ کو کسی کے سر پر تھوپنے کے لئے ہم کسی نہ کسی شخص یا ادارے کو قربانی کا بکرا بنا کر ساری ذمہ داری اس پر ڈال دیتے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے بالکل علیحدہ اور بری الذمہ قرار دے کر اس سے دست بردار اور آزاد ہو جاتے ہیں۔ محبان پاکستان نے اس سانحۂ فاجعہ کا ذمہ دار ذوالفقار علی بھٹو اور پاکستانی فوج کو قرار دے رکھا ہے! کہا جاتا ہے کہ بھٹو نے ملک توڑنے کی سازش کی تھی' پاکستانی فوج نے بزدلی دکھائی۔ باقی پورا ملک اس سے بری الذمہ تھا' کسی اور کا اس سانحے میں نہ کوئی ہاتھ ہے اور نہ کوئی کردار!

میری رائے میں "سانحہ پاکستان" کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا جو ایک سال' چند مہینوں اور کچھ دنوں میں رونما ہو گیا ہو۔ یہ ایسا سانحہ نہیں ہے کہ بھارتی فوج نے حملہ کر دیا اور دس بارہ دنوں میں اس کا تیا پانچہ کر دیا گیا ہو! ایسا ہرگز نہیں ہوا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ناسور برس ہا برس سے رس رہا تھا' یہ زخم بتدریج بڑھتا اور سڑتا و گلتا رہا۔ پاکستان کے مشرقی اور مغربی بازو کے لوگوں کے مابین موجود بھائی چارہ آہستہ آہستہ بے گانگی اور ناراضگی میں بدلتا چلا گیا۔ محبت و الفت دھیرے دھیرے نفرت میں ڈھلتی گئی۔

یہ بات تو خوب سمجھ میں آتی ہے کہ ہم ۱۷ دسمبر کے سانحے کو قومی سطح پر کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس حوالے سے مذاکرے اور سیمینار منعقد نہیں کئے جاتے۔ چند محب وطن لوگ کالم یا مضامین لکھ دیتے ہیں یا کوئی ایک دو سیمینار منعقد کر لئے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اس وقت جن لوگوں کو ملک ٹوٹتا ہوا صاف نظر آ رہا تھا' جن دنوں سازشیں پنپتی ہوئی نظر آ رہی تھیں' اس وقت ملک کے سیاست دانوں' دانشوروں اور محبت وطن سیاسی' سماجی اور دینی راہنماؤں کی بصیرت کو کیا ہو گیا تھا' ان کی ذہانت و فطانت کو کونسا زنگ لگ گیا تھا' ان لوگوں کی حب الوطنی کیوں ماند پڑ گئی تھی' ان کی بصیرت کو کس نے اچک لیا تھا؟ کیا کوئی تحریک ملک کو بچانے کے لئے چلائی گئی تھی؟ لوگ اس سازش کے خلاف سینہ سپر کیوں نہیں ہوئے تھے؟ ہم سازش کرنے والوں کے خلاف کیوں نہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ کیا ہم سب لوگ یہی انتظار کرتے رہے کہ ملک ٹوٹ جائے تاکہ بعد میں ہم سب مل کر اس پر نوحہ خوانی کر سکیں! آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم مشرقی پاکستان کے حالات و واقعات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیں اور دیکھیں کہ وہاں ہم سے کیا غلطیاں سرزد ہوئی تھیں؟ یہ جائزہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمارے موجودہ ملکی حالات کی سنگینی ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہم سے کہہ رہی ہے کہ ہوش سے کام لو' اپنے حالات کو سنوارو اور سنبھالو! تم پہلے بھی اسی سوراخ سے ڈسے جا چکے ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس پہلو پر غور کریں کہ اس وقت کیا ہوا تھا' کیا وجہ تھی کہ بھائی چارہ بٹوارے میں تبدیل ہو گیا۔ یہ حالات و واقعات اتنے اہم ہیں کہ ان کے ایک ایک پہلو پر طویل گفتگو ہو سکتی ہے مگر اس حوالے سے لازماً اختصار کے ساتھ اہم ترین واقعات کو سامنے لایا جانا ضروری ہے تاکہ پوری بات واضح ہو کر سامنے آ سکے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بنگال کا وہ حصہ جو بعد میں مشرقی پاکستان بنا تھا' مسلم اکثریتی اصول کی بنا پر زبردستی پاکستان میں شامل نہیں کیا گیا تھا' بلکہ یہ سب کچھ بنگال کے لوگوں کی بعین دلی خواہشات کا نتیجہ تھا۔ اس خطہ کے لوگوں نے تحریکِ پاکستان کے لئے دوسرے لوگوں کی نسبت سے زیادہ فعال کردار ادا کیا تھا۔ اس کا ثبوت ہندوستان میں ۱۹۴۶ء میں منعقد ہونے والے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کے نتائج سے مل جاتا ہے۔ صوبہ بنگال کے لوگوں نے ایک کارنامہ بلکہ معجزہ کر دکھایا۔ صوبہ بنگال کی صوبائی اسمبلی کی ۱۱۹ نشستیں مسلمانوں کے لئے مخصوص تھیں جن میں سے ۱۱۶ سیٹیں مسلم لیگ نے جیت لیں جبکہ مسلم لیگ کی مخالفت کرنے والے مسلمانوں میں سے ۹۵ فیصد امیدواروں کی ضمانتیں بھی ضبط ہو گئیں۔ ووٹوں کے تناسب کا یہ عالم تھا کہ جہاں مسلم لیگ کے امیدوار کو ۲۵ ہزار ووٹ ملے وہیں مخالف امیدوار کو صرف چھ سو ووٹ ملے۔ یوں مغربی بنگال کی سو فیصد نشستیں مسلم لیگ نے جیت لی تھیں جبکہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی ۵۳۵ نشستوں میں سے ۴۶۴ مسلم لیگ نے جیت لی تھیں۔ سردار عبدالرب نشتر اور خان لیاقت علی خان نے بنگال کے حلقہ سے الیکشن لڑا تھا اس علاقے میں یہ بزرگ پہلے کبھی نہیں گئے تھے لیکن اس کے باوجود دونوں ۹۰ فیصد ووٹ لے کر کامیاب ہوئے تھے۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں میرا تجزیہ یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں نے دیگر علاقے کے لوگوں کی نسبت زیادہ فعال کردار ادا کیا تھا۔

اس حقیقت کو کون نہیں جانتا کہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے لوگوں کے مابین مذہب کے رشتے کے علاوہ کوئی چیز مشترک نہیں تھی۔ جغرافئے کے اعتبار سے دو مختلف خطے ایک دوسرے سے طویل مسافت پر واقع تھے جن کے مابین دشمن کا ملک واقع تھا۔ ہندو آبادی مشرقی بازو میں ایک کروڑ کے قریب آباد تھی۔ اس کے علاوہ نہ رنگ ایک تھا نہ نسل اور نہ زبان ایک تھی نہ تہذیب۔ سب کچھ ہی مختلف تھا۔ صرف ایک ہی رشتہ اور تعلق تھا اور وہ دین و مذہب کا تعلق تھا۔ ہم نے اس رشتے کو مضبوط اور مستحکم نہ کیا۔ ان ہی مجبوریوں اور عوامل کی وجہ سے ہمیں کچھ ایسے اقدامات اور فیصلے کرنے پڑے جو درست نہ تھے مگر ایسے فیصلے غالباً ہماری مجبوری تھی۔ ان اقدامات اور فیصلوں کا بھی جائزہ لیا جانا چاہئے تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ ہمارا حلیہ کس طرح آہستہ آہستہ بگڑتا چلا گیا۔ سب جانتے ہیں کہ ایوب خان کے دور حکومت

میں صنعت و تجارت کو کافی فروغ حاصل ہوا تھا۔ صنعتی ترقی کا اثر مشرقی بازو کے حصے میں بھی آیا اور مشرقی پاکستان میں ڈھاکہ اور چٹاگانگ کے وسیع اور چٹیل میدانوں کی جگہ شاندار صنعتی کارخانے' تجارتی اور کاروباری مراکز وجود میں آئے۔ لیکن ان تمام تجارتی و صنعتی مراکز کا دائرہ کنٹرول براہ راست مغربی پاکستان کے پاس تھا۔ معاملہ صرف یہی نہیں تھا بلکہ ہمارے لوگوں کی بود و باش کا انداز الگ تھا۔ یہاں تک کہ مغربی پاکستان کے سرمایہ دار الگ کالونی میں رہتے تھے۔ بالکل اس طرح جیسے کہ کسی نو آبادیاتی نظام کے حامل سرمایہ دار مزے کرتے ہیں۔ آپس میں محبت و شفقت پیدا کرنے کے لئے' مختلف طبائع کو نزدیک لانے کے لئے اور دلوں کو جوڑنے کے لئے ایک اہم عنصر کی حیثیت باہمی طور پر دونوں اطراف سے شادی کے بندھن کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ تو ہوا کہ شاید کسی مغربی پاکستانی نے کسی مشرقی پاکستانی خاتون سے تو شادی کی ہو لیکن میری دانست میں نہیں ہے کہ کسی مغربی پاکستانی خاتون کو مشرقی پاکستان کے مرد سے شادی کرنے دی گئی ہو۔ یہ ہیں وہ حالات و واقعات جن کے منفی اثرات نے باہمی اعتماد کی فضا کو مکدر کر دیا۔ یحییٰ خان کے دور حکومت میں ہونے والے انتخابات کے بارے میں ہر شخص جانتا ہے کہ وہ نہایت آزادانہ ماحول میں منصفانہ طریقے سے ہوئے تھے' میں ان انتخابات کا عینی شاہد ہوں اس لئے یہ بات وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ انتخابات کے حوالے سے یہ بڑا خوش آئند پہلو تھا مگر اس کے پہلو بہ پہلو ان انتخابات کے نتائج کو تسلیم نہ کر کے باہمی اعتماد کو ٹھیس پہنچائی گئی۔

یحییٰ خان جب مشرقی پاکستان کے دورے پر آئے تھے اور واپسی پر ڈھاکہ ایئرپورٹ پر ان کے ساتھ شیخ مجیب الرحمٰن بھی تھے۔ میری موجودگی میں ایک غیر ملکی صحافی نے یحییٰ خان سے سوال کیا کہ کیا ہم مجیب الرحمٰن کو پاکستان کا مستقبل کا وزیر اعظم کہہ سکتے ہیں؟ جواب میں یحییٰ خان نے کہا تھا کیوں نہیں! لیکن اس قدر واضح موقف کے بعد نہ تو اسمبلی کا اجلاس بلایا گیا اور نہ ہی اقتدار حقیقی نمائندوں کو منتقل کیا گیا۔ اقتدار کا حقیقی نمائندوں کو منتقل نہ کیا جانا مشرقی اور مغربی بازو کے مابین ایک فیصلہ کن موڑ کا حامل ہے۔ اس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان کے لوگوں نے نیا موقف اختیار کر لیا اور پاکستان کی مخالفت میں احتجاجی جلسے اور جلوس کھلے عام منعقد ہونا شروع ہو گئے۔ بنگلہ دیش کے جھنڈے لہرائے جانے لگے۔ فوجی گاڑیوں کو روک کر ان سے "جیو بنگلہ" کے نعرے لگوائے جاتے جو انکار کرتا اسے بے عزت کیا جاتا' اس کی تضحیک کی جاتی۔ یہ کشیدگی یہاں تک بڑھ گئی کہ مغربی پاکستان کی فوج کے لئے سبزی تک پاکستان کے مغربی بازو سے آنے لگی۔ لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خاں کے ساتھ ہمیشہ ملٹری پولیس کی جیپ ہوتی تھی۔ جب لوگوں نے اسے بھی روکنا شروع کر دیا تو صاحبزادہ صاحب نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ ہیڈ کوارٹرز سے ہو کر دفتر چلے جایا کریں گے۔ ایک دو بار وہ اپنے دفتر میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے گئے۔ بعد ازاں صاحبزادہ یعقوب علی خاں واپس مغربی پاکستان آ گئے۔ یہاں آ کر انہوں نے حکومت سے کہا کہ مشرقی بازو میں مزید فوجی نفری بھیجی جائے تاکہ وہاں کی بغاوت کو کچلا جا سکے۔ بہرحال معاملات آہستہ آہستہ بگڑتے چلے گئے۔ مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجی آفیسر پکنک کے بہانے خفیہ میٹنگز کرنے لگے اور عام فوجیوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ گویا مشرقی بازو سے متعلق فوج نے بغاوت کر دی۔ ان حالات میں مزید فوج کی ضرورت لاحق ہوئی۔ ریل اور سڑک کا رابطہ تو پہلے ہی سے منقطع تھا چنانچہ چٹاگانگ کا ڈھاکہ سے رابطہ کٹ گیا۔ کچھ عرصہ تک تو پی آئی اے کا جہاز آتا جاتا رہا بعد ازاں وہ بھی بند ہو گیا۔ ان دنوں میں مشرقی بازو کا ایریا کمانڈر تھا اور سپلائی کا شعبہ میرے ذمہ تھا۔ ٹکا خاں صاحب' صاحبزادہ یعقوب علی خاں کی جگہ آ گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ مجھے جہاز مہیا کر دیئے جائیں تاکہ میں چٹاگانگ جا کر سمندر میں کھڑے جہاز سے توپ خانے کا "ایمونیشن" اتروا سکوں ورنہ وہ خراب ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا بھائی کوئی جہاز اس کے لئے موجود نہیں ہے۔

بہرحال معاملہ بگڑتے بگڑتے اس حد تک پہنچ گیا کہ یہ بات عام ہو گئی تھی کہ عوامی تحریک کا قائد شیخ مجیب الرحمٰن کسی روز بھی یک طرفہ آزادی کا اعلان کر دے گا۔ حتیٰ کہ یحییٰ خان نے ڈھاکہ کے گورنر ہاؤس میں سیاست دانوں کا اجلاس طلب کیا جس میں شیخ نے بھی شرکت کرنا تھی۔ مگر اس اجلاس سے پہلے عوامی لیگ نے ایک بڑا اجلاس طلب کر رکھا تھا۔ شیخ مجیب نے اس اجلاس میں سب کو برا بھلا کہا اور گالیاں دیں غرض جو کہنا چاہتا تھا اس نے کہا۔ سب لوگ اس کی توقع کر رہے تھے کہ وہ یک طرفہ آزادی کا اعلان کر دے گا مگر اس نے اس موقعہ پر ایسا کوئی اعلان نہ کیا۔ اس امید پر کہ شاید کوئی راہ نکل آئے' کوئی بات بن جائے۔ اعلان آزادی نہ کرنے کی وجہ سے عوامی لیگ کے جلسے میں شیخ مجیب الرحمٰن کے خلاف نعرے لگائے گئے۔ لیکن اس کے باوجود شیخ مجیب الرحمٰن صدر مملکت یحییٰ خان کے طلب کردہ اجلاس میں آئے مگر اس شان کے ساتھ کہ انکی کار پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ اس کی کار کو روکتا اور پوچھتا کہ یہ کس ملک کا جھنڈا ہے جسے وہ لگا کر آئے ہیں۔

مذاکرات ناکام ہو گئے اور یہ فیصلہ ہو گیا کہ ایکشن کیا جائے۔ اس وقت تک مکتی باہنی تشکیل پا چکی تھی (جو مشرقی پاکستانی فوج کے بھاگے ہوئے فوجیوں پر مشتمل تھی) فیصلہ ہوا کہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے دن رات کو بارہ بجے مشرقی بازو کے فوجیوں کو "Disarmed" کر دیا جائے گا اور انہیں فوج سے الگ کر دیا جائے۔ بغاوت والے علاقے اور مراکز کو صاف کیا جائے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو رات نو بجے ٹکا خاں کا میرے لئے فون آیا کہ تم روز کہتے تھے کہ مجھے چٹاگانگ جانے کے لئے جہاز چاہئے۔ میں نے کہا کہ کہاں ہے۔ اس پر انہوں نے کہا جہاز تیار ہے اور فلاں فلاں لوگ بھی جا رہے ہیں تم بھی چلے جاؤ۔ میں نے اپنی اہلیہ کو فون کیا کہ میں چٹاگانگ جا رہا ہوں' اس نے کہا دوپہر کے کھانے کے بعد واپسی ہو جائے گی میں نے کہا نہیں شام تک آ جاؤں گا۔ جب ہم جہاز میں بیٹھ گئے تو پتہ چلا کہ آج رات فوجی ایکشن ہونا ہے (اس سے قبل مجھے اس فیصلے کا قطعاً علم نہ تھا حالانکہ میں مشرقی پاکستان میں سپلائی کا انچارج تھا) ان ہی دنوں فوج کے لئے تازہ راشن کی سپلائی وہاں کے لوگوں نے بند کر رکھی تھی اور جو کوئی فوجیوں تک یہ راشن گاڑی کی ڈگی وغیرہ میں رکھ کر پہنچانے کی کوشش کرتا بعد میں اس گاڑی کو آگ لگا دی جاتی۔ بہرحال جہاز میں ہی مجھے معلوم ہوا کہ آج ہی ۲۵ مارچ ۷۱ء کو رات کے ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہی مکتی باہنی والوں نے بھی ایکشن کے لئے منتخب کیا ہے۔

ہمارے ایکشن کا وقت ۱۲ بجے تھا جبکہ ان کے ایکشن کے لئے ساڑھے بارہ بجے کا وقت طے تھا۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ حسن اتفاق تھا یا سوئے اتفاق۔ ان کے خلاف یہ ایکشن ہمارا ردعمل تھا یا ہمارے ایکشن کے خلاف ان کا ردعمل۔ میں چٹاگانگ کے نیول ایئربیس پر ایمونیشن کو "ان لوڈ" کرانے کے لئے پہنچا تو مجھے بتایا گیا کہ یہ جہاز "ان لوڈ" نہیں ہو سکتا جب تک عوامی لیگ اس کی اجازت نہ دے۔ میں

نے کہا کیسی عجیب بات ہے میں فوجی آفیسر ہو کر عوامی لیگ سے کیونکر اجازت لوں! میری حیرانگی کی اس وقت انتہا نہ رہی جب میں نے یہ حکم دیا کہ جہاز سے لازماً اسلحہ "ان لوڈ" ہو گا۔ چنانچہ میرے حکم کے مطابق فوجیوں نے سٹاف سے مل کر جب ایمونیشن کو اتارنا شروع کیا تو ہزاروں کی تعداد میں بنگالی ڈنڈوں اور آہنی سریوں سے مسلح ہو کر وہاں آ گئے اور کہنے لگے ہم حملہ کر دیں گے۔ وہاں چار دیواری کے گرد میں نے پنجاب رجمنٹ کے ایک فوجی کو ٹاور پر کھڑا کر دیا کہ جو شخص دیوار پھلانگنے کی کوشش کرے یا دیوار توڑے اس پر فائر کر دینا۔ باہر "جیو بنگلہ' جیو بنگلہ" کے نعرے بلند ہوتے رہے۔ اس کی اطلاع انٹیلی جنس کے ذریعے ٹکا خاں تک پہنچی' انہوں نے مجھے فون کیا کہ یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟ میں نے کہا میں تو صرف ایمونیشن اتارنا چاہتا ہوں۔ اس پر انہوں نے کہا۔ پنجاب رجمنٹ کی بٹالین کو واپس بھیج دو اور ان کی جگہ بنگال رجمنٹ کے سپاہی بلا لو۔ وہ اس لئے کہ اس رات ایکشن کرنا تھا۔ حسب الحکم تعمیل کی گئی اور بنگالی حضرات کے ساتھ ساری رات ہم ایمونیشن اتارتے رہے۔ رات کے بارہ بجے چٹا گانگ میں ہر طرف فائرنگ شروع ہو گئی۔ صبح تک ہم جہاز سے ایمونیشن اتار رہے تھے۔ وہ بنگالی فوجی جنہیں اس رات تک غیر مسلح نہیں کیا جا سکا تھا انہوں نے ایمونیشن سے بھری ریل گاڑی کو آگ لگا دی۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے بہت جلد آگ پر قابو پا لیا۔

ان واقعات سے حالات کا حقیقی نقشہ آپ کے سامنے آ گیا ہو گا اور یہ بات جو ہمارے یہاں ہے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ تو علیحدگی نہیں چاہتے تھے بھٹو نے سازش کی' پاکستانی فوج نے بزدلی دکھائی اور پاکستان دولخت ہو گیا۔ ان حالات و واقعات کے پس منظر میں اصل وجوہات تک رسائی ہو سکتی ہے۔ رات کے اڑھائی بجے مغربی پاکستان کے لباس میں ملبوس ایک خاتون جس نے بچہ اٹھایا ہوا تھا مجھے برا بھلا کہنے لگی۔ میں نے کہا خیر تو ہے بی بی! اس نے کہا کیا تم جانتے ہو اس شہر میں مغربی پاکستانی خاندانوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔ بچے کو میرے سامنے کر کے کہنے لگی کہ اس کے پہلو میں چھرا گھونپا گیا ہے' زخم بہت بڑا تھا۔ میں نے ایک افسر کو بلایا اور اسے خاتون کو میڈیکل کیمپ میں لے جانے کو کہا۔ میں نے کہا مجھے کچھ کرنا چاہئے۔ بڑی بھیانک اور خطرناک صورت حال خاتون نے بیان کر دی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ بنگالی گھروں میں گھس کر لوٹ مار کرتے' عصمت دری کرتے اور واپسی پر گھروں کو آگ لگا دیتے۔ اگلے روز خادم حسین صاحب نے مجھے کہا کہ ہمارے علاقے کو کنٹونمنٹ سے ملا دیا جائے۔ درمیان میں سول پولیس کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس نے ہم پر حملہ کیا جس سے ہمارے کافی لوگ شہید ہو گئے۔ مزاحمت کرنے والوں کو ہمیں گولی سے اڑانا پڑا۔ اس کے بعد ہم جب پہاڑی کے اوپر پہنچے جہاں ان لوگوں نے اپنے مورچے بنا رکھے تھے وہاں کئی لوگوں کو گولی سے اڑانا پڑا۔ اس کے بعد ہم نے ریلوے ہیڈ کوارٹر کی طرف رخ کیا۔ مغربی پاکستانی ریلوے کے آفیسر اور ٹیکنیشن سب اس پہاڑی کے اوپر گھروں میں رہتے تھے۔ ایک ایک غسل خانے میں پوری پوری فیملی سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ میں نے خود دروازے کھٹکھٹا کر اپنا تعارف کروایا تب وہ لوگ باہر آئے۔ ان کی ہمت بڑھائی۔ وہاں ایک شولہ مارکیٹ تھی' پھر میں اس کی جانب بڑھا۔ وہاں ہماری رجمنٹ ایسٹ بنگال نامی متعین تھی جس کے کمانڈنگ آفیسر مغربی پاکستانی تھے۔ ان کی لاش کو میں نے خود جانوروں سے چھڑوایا۔

اسی علاقے میں واقع آفیسر میس میں مغربی پاکستانی فوج کے افسروں کی لاشوں کو دیکھا۔ پھر میں اصفہانی جیوٹ مل کی طرف بڑھا اور میں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے جس کے باہر کافی گہری اور چوڑی نالی تھی جو انسانی خون سے اٹی ہوئی تھی اور ہال کے اندر بچوں اور خواتین کو برے طریقے سے ذبح کیا گیا تھا۔ چار اور چھ مہینے کی عمروں کے لاتعداد کپڑے پڑے تھے۔ یہ تھے وہ حالات۔ چنانچہ ۲۵ مارچ کے ایکشن کے نتیجے میں بغاوت پر قابو پا لیا گیا۔ میرے خیال میں اللہ نے اس دن ہمیں ایک موقعہ فراہم کیا تھا کہ اگر سنبھل سکتے ہو تو سنبھل جاؤ۔ مولائے کریم نے اس خطۂ ارضی کو سنبھلنے کے کئی مواقع عطا فرمائے۔ پہلے مغلوں اور لودھیوں کو موقع ملا کہ اسلامی حکومت قائم کریں' پھر ہمیں آزاد خطہ عطا کیا گیا۔ یہ ایک انہونا واقعہ ہوا' پاکستان کی تشکیل کی صورت میں یہ ایک معجزہ ظہور پذیر ہوا۔

۲۵ مارچ کے فوجی ایکشن کی صورت میں بھی پاکستان کو بچانے کا ایک موقعہ قدرت نے ہمیں عطا کیا تھا مگر ہم نے کہاں سنبھلنا تھا۔ سول معاملات کو مارشل لاء آفیسروں نے ہمیشہ اپنے ٹاؤٹوں کے مشورے سے حل کرنے کی کوشش کی اور عوام الناس پر تشدد روا رکھا گیا' ذہین لوگوں کو بے دریغ قتل کیا گیا اور انہیں باغی قرار دے کر گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ آخر بات بنتی تو کیسے؟ حالات بگڑتے چلے گئے۔ مغربی پاکستانی لوگ جمع ہو کر ڈھاکہ ایئرپورٹ پر پہنچ گئے تھے تاکہ واپس مغربی پاکستان آ سکیں۔ ان حالات میں ایسے پاکستانی موجود تھے جو جہاز کی ٹکٹیں بلیک میں فروخت کر رہے تھے۔ اس عذاب سے لوگوں کی جان چھڑانے کے لئے میں نے ۱۳۰ ہرکولیس طیارے میں ایسے سب لوگوں کو سوار کرا کر کراچی بھجوا دیا۔ یہ لوگ اگلی فلائٹ سے پھر واپس آ گئے اور اپنے دھندے میں مصروف ہو گئے۔ میں نے وہاں ۱۵۰ روپے میں کاریں فروخت ہوتے دیکھی ہیں۔ میں نے خود اپنی اہلیہ اور بیٹی کے لئے بھی ہوائی ٹکٹ لیا تھا۔ میرے ہاں خواجہ شہاب الدین اور ان کی اہلیہ محترمہ جو جنرل ولی الدین کے والدین تھے' آئے۔ ویسے بھی یہ لوگ قابلِ احترام تھے۔ کہنے لگے ہمیں واپس بھجوانے کا بندوبست کریں میں نے اپنی اہلیہ اور بیٹی کے ٹکٹوں کے ذریعے انہیں واپس بھجوا دیا۔

یہ حالات اسی طرح آہستہ آہستہ خراب ہوتے چلے گئے۔ جہاں میں نے قید کاٹی وہاں شاہ دیو سنگھ نامی شخص بھارتی فوج کا بریگیڈیئر تھا' وہ ملاقات کے لئے آیا تو کہنے لگا میں ڈھاکہ میں ہونے والی تخریب کاری کا انچارج تھا۔ میں نے کہا تم کیسے چھپے رہے؟۔ کہنے لگا میں رکشا چلاتا تھا اور ہر جگہ پہنچ جاتا تھا اور چھپا بھی رہتا تھا۔ جگہ جگہ دھماکے' فائرنگ' جو اب کراچی میں ہو رہے ہیں بالکل ایسے ہی مشرقی پاکستان میں ہوتے تھے۔

بھارتی سیکورٹی فورس کے لوگوں کو بھی مشرقی پاکستان کے لوگوں نے پناہ دی۔ وارداتیں بھارتی فوجی کرتے اور بدنام پاکستانی فوج ہوتی تھی۔ ایک تیر میں دو شکار کرتے تھے۔ جھڑپوں میں جب شدت آ گئی تو مکتی باہنی والے بھی اس میں شریک ہو گئے۔ پھر باقاعدگی سے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ جن لوگوں کو ہم نے البدر اور الشمس کے ذریعے اسلحہ اور دیگر اشیاء کی سپلائی کے لئے خود بھرتی کیا تھا انہوں نے ہم پر فائرنگ شروع کر دی۔ مشرقی پاکستان میں بہنے والے تمام ندی نالوں کے پل تباہ کر دیئے گئے' کشتیاں غائب کر دی گئیں' سنیئر بھی نظر نہیں آتے تھے۔ گویا فوج کی نقل و حرکت کو تقریباً مفلوج کر دیا گیا۔ میں یہ بات وثوق سے کہتا ہوں کہ جس مشرقی پاکستانی نے پاکستانی فوج کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی اسے اس کا موقعہ نہیں ملا ورنہ جسے

کوئی موقعہ ہاتھ آیا اس نے لازماً اپنے ہاتھ رنگے۔ ایک ہسپتال کے معائینے کے دوران مجھے ایک زخمی کپتان سے ملایا گیا۔ میں نے سوال کیا تم کیسے زخمی ہوئے؟ کہنے لگا میں چٹاگانگ میں تھا۔ میں نے پوچھا کہ اصفہانی جیوٹ مل کے پاس تمہارا ہی میس تھا۔ میں نے سنا ہے کہ تم مغربی پاکستانی عورتوں کو وہاں برہنہ کر کے سروس کے لئے استعمال کرتے تھے؟ کہنے لگا ہاں۔ جس پر میں نے کہا تمہاری کیا سزا ہے؟ کہنے لگا گولی مار دو۔ آپ اندازہ لگائیں کہ کس انداز میں ایک کپتان جنرل سے مخاطب تھا! میرے سامنے ایک بارہ سال کا لڑکا لایا گیا۔ جس نے راشن لانے والی بیل گاڑی کو دھماکے سے اڑانے کا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ میں نے کہا تم نے یہ کام کیا ہے؟ کہنے لگا ہاں۔ میں نے کہا تم اور کیا کیا کر سکتے ہو؟ کہنے لگا میں سرنگ لگا سکتا ہوں، ٹینک شکن سرنگ فٹ کر سکتا ہوں، گرنیڈ آرم کر سکتا ہوں، شین گن چلا سکتا ہوں۔ لڑکا کہنے لگا چودہ اگست والے دن جو تمہارا ایک سپاہی جھنڈا لہراتے ہوئے گولی سے مارا گیا تھا، وہ میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔ میں نے کہا تمہارے ساتھ کیا حشر کروں؟ کہنے لگا مجھے گولی مار دو۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ نوبت کیوں آئی؟ کیسے آئی؟ حالانکہ مشرقی پاکستان کے لوگ ہم سے بہتر مسلمان تھے، دھیمے مزاج کے شفیق اور بہادر لوگ۔ ۶۵ء کی جنگ میں قصور کے محاذ پر میرے ساتھ بنگالیوں کی ایک پلٹون نے بڑی بے جگری سے جنگ میں حصہ لیا تھا اور بہادری کے کئی تمغے حاصل کئے تھے۔ اس کے باوجود یہ نوبت کیوں آئی؟ حاصل گفتگو یہ ہے کہ آپ اپنے عوام کو تشدد کے ذریعے نہیں دبا سکتے۔ گولی دشمن کے سینے پر تو سجتی ہے اپنے ہم وطن کے سینے پر اچھی نہیں لگتی۔ ناراض بھائی سے اس کا گلہ شکوہ دریافت کرو کہ بھائی تم کیوں ناراض ہو؟ یہ جو ہمارا فرعونی اندازِ حکمرانی ہے کہ عوام کو گولی مارو ان پر تشدد کرو اور انہیں جیلوں کی دیواروں کے پیچھے دھکیل دو۔ یہ نشہ بہت برا ہے۔ میں نے ان لوگوں کی محبت و شفقت بھی دیکھی ہے۔ میں نے اس پیار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہ پاکستان کے وفادار شہری تھے مگر حالات بگڑتے چلے گئے اور ہم نے ان کی اصلاح کے لئے کوئی صحیح قدم نہ اٹھایا۔ بس یہی رویہ آج ہم کراچی کے ساتھ اختیار کر رہے ہیں۔ بے حسی کا وہی انداز دیکھنے میں آ رہا ہے۔ دیکھ لیں گے، نپٹ لیں گے اور اللہ بہتری کرے گا۔ الغرض اب بھی اگر ہم نے ماضی کے تجربات سے سبق نہ سیکھا اور سوچ بچار کی عادت نہ اپنائی، مشرقی پاکستان کے سانحہ سے کوئی سبق نہ سیکھا جو دکھ دینے والا ہے، جس کے نتیجے میں عظیم ترین اسلامی مملکت دولخت ہوئی۔ ہمارا دشمن یہ کہنے لگا کہ ہم نے دو قومی نظریہ کو سمندر میں ڈبو دیا ہے۔ بھائی نے بھائی کے خلاف بندوق کیوں اٹھائی۔ مشرقی پاکستان میں پاکستان کی حفاظت کے لئے جان کی قربانی دینے والے لوگوں کی قبروں کے نشانات بھی نہیں ملتے۔ وہاں ان کی نعشوں کو بھی زمین سے باہر پھینک دیا گیا۔ نومبر ۷۱ء تک ۴۰۰۰ فوجی اس ملک کی بقاء و سلامتی کے لئے شہید ہو چکے تھے جن میں سے ۲۳۷ آفیسر تھے۔ جنگ سے پہلے کے حالات سے ہم نے سبق نہ سیکھا تو قدرت زبردستی کسی کا ہاتھ پکڑ کر اسے راہ نہیں دکھاتی۔ دل میں اچھائی ہو تو اصلاح کی توفیق بھی مل جاتی ہے لیکن اگر بے حسی کا یہی عالم رہا تو پھر قوم کی شامت اعمال تو ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔ ○○

رباط کانفرنس جیسی تقریبات کی حیثیت اب ہے کیا؟

نیو ورلڈ آرڈر کا مشن ہم خود پورا کریں گے

ہماری قراردادوں سے دنیا کی واحد سپر پاور کا کچھ نہیں بگڑتا

کلیم اللہ ملک

اسلامی سربراہ کانفرنس ایک ایسا ہوّا تھی کہ دشمنان اسلام اس کے نام سے کانپ اٹھتے تھے۔ اس میں پیش کئے جانے والے ایجنڈہ کو تبدیل کرانے کے لئے کوشاں رہتے۔ انہیں خدشہ لاحق تھا کہ امت مسلمہ کسی ایسے نکتہ پر متحد نہ ہو جائے جو اس کو دوسرے دور عروج کی بنیاد مہیا کرنے کا باعث بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ۶۹ء میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے وجود نے امت کے ہر فرد کو ایک نیا ہدف دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بے جان قوم نئی کروٹ سے بیدار ہو رہی ہو۔ اس طرح کے شرارہ نے امت کے وجود میں حرکت پیدا کی لیکن افسوس صد افسوس کہ "شاہین نہ بنا تو" کے المناک حادثہ نے اس کانفرنس کے اصل مقاصد کو اس کی نظروں سے اوجھل کر دیا اور اب اس پلیٹ فارم پر بھی اسی کیفیت کا قبضہ ہے، جس کے تحت تنظیمیں اپنے وجود کی نفی خود اپنے ہاتھوں شروع کر دیا کرتی ہیں۔ اس کیفیت کو مختصر ترین الفاظ میں یوں ادا کیا جا سکتا ہے کہ "تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا"۔ اس امر میں تو شک نہیں کہ مفکر اسلام کے مخاطب امت مسلمہ تھی کہ۔

تیرے آباء کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے
ہے وہی باطل تیرے کاشانہ دل میں مکیں
غافل اپنے آشیاں کو آ کے پھر آباد کر
نغمہ زن ہے طور معنی پر کلیم نکتہ بیں

جو کچھ آج اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے پلیٹ فارم پر نظر آ رہا ہے، اس کا فکری تجزیہ انہوں نے بہت پہلے کر دیا تھا۔ لیکن حیف ہے مسلم سربراہان پر کہ وہ امت کو موجودہ تنزلی کے دور سے نکالنے کی بجائے اس تنزلی کے استحکام کے لئے اپنے اپنے طور پر حصہ بقدر جثہ کے مطابق کوشاں ہیں۔ جس سے یہ تنظیم اپنے اصل مقاصد کھو رہی ہے۔

اس کانفرنس میں امت محمدیہ کے اتحاد کی اصل اساس بننے والی کسی فکر، قرارداد یا لائحہ عمل پر امت کے اکابرین متفق نہیں ہو سکے۔ ۵۲ نکاتی ایجنڈہ پر بائیسویں وزرائے خارجہ کی کانفرنس منعقدہ کاسابلانکا میں ۱۲ دسمبر کو غور و خوض کیا گیا۔ ان نکات پر اتفاق کو ساتویں اسلامی سربراہی کانفرنس کے اجتماع میں

زیر بحث لایا گیا' جو ۱۳ دسمبر کو شروع ہوئی لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہر مسلم ملک کا سربراہ امریکہ کا ایجنٹ ہو اور نیو ورلڈ آرڈر کا خوف اس کے دل و دماغ پر طاری ہو۔ اسلامی کانفرنس کے سربراہ اجلاس میں بیٹھ کر بھی ان میں سے ہر سربراہ امریکہ بہادر کی ناراضگی کے نکات کو پیش کرنے سے گریزاں رہا ہے۔ امریکہ نے قاہرہ کانفرنس کے ذریعے فحاشی و بدکاری کو امت سے کھلم کھلا تسلیم کرانے کے لئے حسنی مبارک کے ذریعے جو تیر اپنے اصل ہدف پر لگایا تھا وہ بڑا موثر ثابت ہوا' جس پر ایران کی یہ تجویز تشنہ رہی جس میں وہ اسلام کے خلاف مغربی تحریک کو نہ صرف زیر بحث لانا چاہتے تھے بلکہ ثقافتی حملوں کے نئے انداز کو دشمنان اسلام کی نئی چالبازیوں کے طور پر کانفرنس کے سامنے لانا مقصود تھا۔ امت کے اس عظیم پلیٹ فارم کی جانداری کا اندازہ تو صرف بوسنیائی مسلمانوں کی مظلومیت سے کیا جا سکتا ہے کہ اب تک اس پر عائد اسلحہ کے حصول پر پابندی کو ہٹا نہیں سکی اور فنڈز مہیا کرنے میں بھی مسلم امہ کی رفتار کا پہلا سا عالم نہیں رہا۔ القدس کے بعد جلتا بجھتا کشمیر ہماری بے حسی پر نوحہ کناں ہے کہ "خاک ہو جائیں گے ہم تمہاری قرداوں کے منظور ہونے تک"۔ میر کی سادگی کی طرح میری امت کے سربراہ افغانستان اور صومالیہ میں امن کی بھیک ان سے مانگ رہے ہیں جو وہاں فتنے پیدا کرنے کا باعث ہیں اور اس کانفرنس میں سینہ بہ سینہ اسرائیل کو تسلیم کر لینے اور تقریباً آمادگی کو بھی ظاہر کرنے کی کوششیں ہوئیں جس میں اہم کردار حسنی مبارک کے بعد ہمارا یعنی پاکستان کا نظر آتا ہے۔ سوچنے کا مقام ہے کہ ہم کہاں پہنچ گئے ہیں یا پہنچنے والے ہیں--- بقول شاعر۔

میں محبتوں کا پیامبر ہوں نفرتوں میں گھرا مگر
کیا وقت نے مجھے در بدر میں پلٹ سکوں جو حیات میں
یہ ساعتوں پہ جو شور ہے یہ صدائے وقت کا زور ہے
یا مرے ہی دل کا یہ چور ہے جو چھپا ہے میری ہی گھات میں

امریکی ہدایات کے مطابق کانفرنس کی کارروائی چلانے میں سعادت مندی کا عالم ذرا دیکھئے کہ کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں الجزائر کے وزیر اعظم کی طرف سے اسلام کو سیاسی مقاصد کے استعمال سے روکنے کے لئے ایک تحریک مذمت پیش کی گئی۔ اس کے علاوہ ایک ضابطہ اخلاق بھی مرتب کیا گیا جس کے تحت کسی شدت پسند گروپ کی حمایت نہیں کی جائے گی۔ جب سے نیو ورلڈ آرڈر سوویت یونین کے انہدام کے بعد نئی آب و تاب سے منظر عام پر چمکا ہے' اس وقت سے بنیاد پرستوں کے قلع قمع پر پورا زور صرف ہو رہا ہے۔ دراصل یہ ساری اصطلاحیں اسلامی غیرت مند تنظیموں کے خاتمے کے لئے استعمال ہو رہی ہیں۔ ان بنیاد پرست تنظیموں کو امریکہ سی آئی اے اور دیگر خفیہ ایجنسیوں خصوصاً "فری میسن" کے ذریعے دنیا بھر میں زچ کرنے کے لئے خفیہ منصوبوں پر عمل کر رہی رہا تھا کہ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارتے ہوئے ان مسلمان ممالک کے سربراہ بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے' جن ممالک میں اسلامی تحریکیں انتخابی یا انقلابی طور پر حکومت حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ بنیاد پرستی یا شدت پسندی کا خوف ان پر اگرچہ اپنی حکومتوں کے تحفظ تک ہی قائم ہے لیکن وہ امت مسلمہ میں رہی سہی حریت فکر کو ٹھکانے لگانے کے عمل میں شریک ہو کر اسلام دشمنوں سے بڑا کردار ادا کر رہے ہیں۔ شاہ فیصل' ذوالفقار علی بھٹو اور جنرل ضیاء الحق جیسے مسلم سربراہوں کا دوبارہ راستہ روکنے کے لئے نیو ورلڈ آرڈر نے جو خوف طاری کرنے کی پلاننگ کی ہے' تقریباً موجودہ تمام مسلمان ممالک کے سربراہان نے اس خوف کو اپنے سروں پر مسلط کر لیا ہے' جس کے باعث ان کے منہ سے امت کے وسیع تر مفاد کا ایک جملہ بھی سنائی نہیں دیتا۔ حالانکہ نیو ورلڈ آرڈر کا نعرہ تو ۱۷۷۶ء میں امریکہ کے اعلان آزادی کے ساتھ ہی لگا دیا گیا تھا۔ لیکن اس کی ریشہ دوانیوں کے باوجود ہمارے جری راہنماؤں نے امت کے مفادات حاصل کرنے کی سبیل پیدا کی۔ اگرچہ انہیں اس کی سزائیں دی گئیں۔ ان کے لاشے تڑپائے گئے۔ انہیں خود معلوم بھی تھا کہ ہمیں برداشت نہیں کیا جا رہا لیکن انہوں نے اس راہ پر سفر کو اپنی جان کے عوض امت کی بہتری سے تعبیر کیا۔ لیکن اب تو اس ضمن میں ہر طرف اندھیرا ہی لگتا ہے۔ خوفناک منصوبوں کی تشہیر سے ہمارے راہنما اور زیادہ بے جان ہو جاتے ہیں۔

۱۹ فروری ۱۹۹۳ء کو کینیڈا میں شائع ہونے والی کتاب "نیو ورلڈ آرڈر اینڈ دی تھرون آف دی اینٹی کرائسٹ" کے صفحہ نمبر ۶ پر تاریخی حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے کہ نیو ورلڈ آرڈر کا نعرہ سابق صدر بش نے نیا نہیں دیا تھا بلکہ امریکہ کی آزادی کے موقع پر ہی اس کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ اس منصوبے کا بانی پیدائشی یہودی ڈاکٹر آدم ویشاپٹ تھا' جو یہودیوں کا مذہبی راہنما بھی رہ چکا تھا۔ بعد میں اس نے اپنی علیحدہ تنظیم قائم کر لی اور یکم مئی ۱۷۷۶ء کو نیو ورلڈ آرڈر کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر آدم ویشاپٹ اس کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ دنیا میں یہ لوگ ہی ذہین ہیں جنہیں دنیا پر حکمرانی کا حق ہے۔ انہوں نے اس پر عمل درآمد کے سلسلہ میں اس کا ایک مخروطی نشان بھی بنا لیا جو آج کل امریکی ڈالر پر بھی موجود ہے۔ اس نیو ورلڈ آرڈر کو ۱۷۸۲ء کو "آرڈر آف دی ایلومیناٹی" میں ضم کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے یہ "فری میسن" تنظیم کا بھی ایک اہم علامتی نشان بن گیا تھا۔ ڈالر پر شائع ہونے والے دائرہ کے اندر مخروطی عمارت کے نیچے جو الفاظ لکھے ہوئے ہیں ان کا انگریزی ترجمہ "نیو ورلڈ آرڈر" ہی ہے۔

دنیا میں مسلمان پر زاویہ حیات تنگ کیا جا رہا ہے۔ مسلم مالک کی سرزمین پر اسرائیلی پرچم لہرائے جا رہے ہیں۔ مسلم انقلابی تحریکوں کے ارکان کو مسلم سربراہان مملکت کے ہاتھوں تہ تیغ کیا جا رہا ہے۔ مسلم ممالک میں لسانی' علاقائی و نسلی تنازعات کے بعد سرحدی جھگڑے پیدا کر کے انہیں آپس میں لڑنے پر آمادہ کرنے کے لئے اپنا اسلحہ عسکری و افرادی قوتیں انتہائی مہنگے داموں فریقین تک پہنچائی جا رہی ہیں۔ اس سے زیادہ امت پر کڑا وقت اور کیا ہو گا کہ ہم بچ نکلنے میں کامیابی تصور کریں۔ موت نے بالآخر ہمیں ایک نہ ایک دن ٹھکانے لگانا تو ہے ہی' کیوں نہ ہم دین کی سربلندی اور امت کے عروج کی خواہش پر جان دیں۔ جو لوگ جرات سے اپنے مافی الضمیر کے مطابق کام کر گئے ہیں اور دشمنوں کی سازشوں کا لقمہ بن گئے ہیں وہ ہم سے لاکھ درجہ بہتر ہیں۔ کم از کم وہ نیو ورلڈ آرڈر کے خوف سے دبے تو نہ تھے۔ ان میں امت کی قوت قائم کرنے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ انہوں نے امت میں نظم و ضبط کی اپیلیں نہیں کیں بلکہ اس شوق میں بہت آگے گئے۔ آج انہی جرات مند' باغیرت اور باہمت راہنماؤں کی روحیں ہمارے بے حس ملی راہنماؤں کو پکار رہی ہیں۔ بقول علامہ اقبال

غرض ہے پیکار زندگی سے کمال پائے ہلال تیرا
جہاں کا فرض قدیم ہے تو' ادا مثال نماز ہو جا
وجود افراد کا مجازی ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ' یعنی آتش زن طلسم مجاز ہو جا

نیل کے ساحل سے لے کر...

ترک نوجوان اب اسلام کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں

محمد سمیع

۱۹۹۴ء کے انتخابات میں رفاہ پارٹی کا گراف اونچا ہوا

فوج دستور کے دفاع کے نام پر سیکولرزم کو تحفظ دے رہی ہے

خلافت عثمانیہ کے بعد ترکی مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں مسلم دنیا کی پہلی سیکولر ریاست کی صورت میں نمودار ہوا۔ یونان کو 1922ء میں شکست دے کر اتاترک ترکی کے تن تنہا بادشاہ تھے۔ لوگ ان کو اپنا ہیرو اور مسیحا سمجھتے تھے۔ جنگ کے دوران انہوں نے اسلامی نعروں کا استعمال کر کے لوگوں کو جہاد پر ابھارا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتاترک اختتام جنگ کے بعد مغرب کی نقالی میں ترکی کو ایک سیکولر ریاست بنا دیں گے۔ لیکن حکومتی سطح پر چلائے جانے والے سیکولر موومنٹ سے ملک کے عوام کی بڑی اکثریت کبھی بھی متاثر نہیں ہوئی۔ تصوف کی تحریکوں نے اتاترک کی اسلام مخالف پالیسیوں کا دیہاتوں میں خصوصاً متاثر کن انداز میں مقابلہ کیا البتہ انقرہ' ازمیر اور استنبول جیسے شہروں میں آبادی کا ایک اچھا خاصا حصہ اتاترک کے الحاد و سیکولرزم کا حامی بن گیا۔ یہ طبقہ اس وقت سے مغرب کی نقالی میں علی الاعلان مذہب بیزاری کی تبلیغ کرتا رہا ہے اور مغرب نواز فوج کی مدد سے اس نے ہمیشہ ترکی پر حکومت کی ہے۔ حکومت میں یا حکومت و اقتدار سے قریب رہنے کی وجہ سے اس طبقے نے سیاسی و معاشی فائدے بھی اٹھائے ہیں۔ مختصراً یہ کہ وہاں کا مراعات یافتہ طبقہ ہی مغربیت اور سیکولرزم کا حامی ہے۔ یہی طبقہ فوج اور بیوروکریسی کی مدد سے موجودہ نظام کو قائم رکھنا چاہتا ہے کیونکہ اس میں اس کا فائدہ ہے۔

لیکن پچھلے پندرہ سالوں میں ترکی کے نوجوانوں خصوصاً شہروں کے پڑھے لکھے نوجوانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کی طرف راغب ہوئی ہے۔ یہ لوگ مغرب کے پیمانے کے مطابق انتہا پسند یا عسکریت پسند بنیاد پرست نہیں ہیں بلکہ یہ لوگ مغربی طرز کا لباس زیب تن کرتے اور ان کی خواتین نئے فیشن کے حجاب پہنتی ہیں۔ یہ مغربی طرز پر قائم کئے گئے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے گریجویٹ ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسے ایک صاف ستھرا کرپشن سے پاک نظام زندگی تصور کرتے ہیں۔ یہ لوگ ترکی کے عوام کے سامنے بدعنوانیوں میں ملوث سیاست دانوں کے مقابلے میں خود کو ایک متبادل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ 80ء کی دہائی کے درمیانی وقفے میں اسلام پسند سیاست دان ارکان کی قیادت میں حامیان اسلام ایک قابل لحاظ طاقت بن کر ابھرے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ ملک کے اقتدار پر قبضہ کر لیں گے لیکن وہاں کی مغرب نواز فوج نے دخل اندازی کر کے ملک کے سیکولر کیریکٹر اور دستور کی حفاظت کے نام پر اسلام پسندوں کو متوقع فتح سے محروم کر دیا۔ لیکن گذشتہ مارچ میں ترکی کے اسلام پسندوں کی جماعت "ویلفیئر پارٹی" کی مقامی انتخابات میں نمایاں کامیابی سے اہل مغرب اور خود ترکی کے مغرب نوازوں کو اسلام ایک بار پھر خطرناک نظر آنے لگا ہے۔ اگرچہ "ویلفیئر پارٹی" 19 فی صد ووٹ لے کر تیسرے نمبر پر ہے' اس لئے کہ ٹرو پاتھ نے 22 فیصد اور مدر لینڈ نے 21 فیصد ووٹ حاصل کئے ہیں۔ باقی پارٹیوں نے اس سے بھی کم ووٹ حاصل کئے ہیں لیکن ویلفیئر پارٹی نے اس ملک کے دو بڑے شہروں راجدھانی انقرہ اور استنبول پر قبضہ کر لیا ہے۔ دونوں جگہ ویلفیئر پارٹی کے میئر منتخب ہوئے ہیں۔ ویلفیئر کی اس کامیابی نے مراعات یافتہ سیکولر طبقہ کو ایک زبردست جھٹکا دیا ہے۔ انہیں اندیشہ ہے کہ اگر اپنے اعلان شدہ پروگرام کے مطابق "رفاہ پارٹی" نے "قناعت پسندی" کے اقدامات نافذ کئے تو ان کے عیش و آرام میں خلل پڑے گا۔

صرف مراعات یافتہ طبقہ ہی نہیں نام نہاد سیکولر پارٹیوں کو بھی اندیشہ بلکہ خطرہ ہے کہ کہیں آئندہ عام انتخابات میں جو دو سال بعد ہونے والے ہیں "رفاہ پارٹی" کو ایسی ہی نمایاں کامیابی نہ حاصل ہو جائے جیسی کہ مارچ کے "مقامی اداروں" کے انتخابات میں حاصل ہوئی ہے۔ بظاہر ایسی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انقرہ اور استنبول میں اپنے وعدہ کے مطابق "رفاہ پارٹی" عوام کو ایک کرپشن سے پاک انتظامیہ فراہم کرے' جس نے خود کو لوگوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا ہو۔

مارچ میں مقامی اداروں کے لئے انتخاب میں دو نعروں نے خاص طور پر ان کے حق میں لوگوں کو ووٹ ڈالنے پر مجبور کیا۔ اسلامی تقویٰ' قناعت پسندی اور صاف ستھری حکومت۔ اس کا واضح مفہوم یہ تھا کہ ترکی کے موجودہ حکمران کرپشن میں ملوث ہیں۔ لادینیت اور مادیت میں اپنے پختہ یقین کی وجہ سے یہ لوگ عوام کو صاف ستھری حکومت فراہم ہی نہیں کر سکتے۔ مزید برآں' جو لوگ اپنے عیش و آرام کو اولیت دیتے اور حکومت کے خزانوں کو اس کے لئے لوٹتے ہیں وہ عوام کے معاشی مسائل کو بھی ٹھیک طریقے سے حل نہیں کر سکتے۔ "رفاہ پارٹی" نے "قناعت پسندی" اور صاف ستھری حکومت فراہم کرنے کے نعروں کے ساتھ شہروں کے عوام کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے وعدے بھی کئے۔ ٹریفک کے نظام کو بہتر بنانے' ماحول کو آلودگی سے پاک کرنے اور گاؤں سے شہروں کی طرف بھاگ کر آنے والے کسانوں کے لئے بنیادی سہولتیں فراہم کرنے کے وعدوں نے انقرہ اور استنبول کے عوام کو "رفاہ پارٹی" کے حق میں کر دیا۔ مزید برآں' اسلام کی طرف لوگوں کی بڑھتی ہوئی رغبت نے بھی "رفاہ پارٹی" کی کافی مدد کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ "رفاہ پارٹی" اپنے وعدے کس طرح پورے کرتی ہے۔ ظاہر ہے وزیر اعظم مسز تانزو سیلر کی حکومت دل سے انقرہ اور استنبول کے میئروں کی مدد

کرنے سے پھر رہی ہے۔

اس کے علاوہ مراعات یافتہ سیکولر طبقہ اور ان کا ہم نوا مغربی پریس پہلے ہی ان کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے میں مصروف ہو چکا ہے۔ وہ ترکی کے عوام اور اہل مغرب کے دلوں میں یہ خوف پیدا کر رہے ہیں کہ "رفاہ پارٹی" ترکی کو الجیریا جیسی خانہ جنگی کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہی پرانے اعتراضات کہ عورتوں کو حجاب میں بند اور نائٹ کلبوں پر پابندی عائد کر کے ملک کو ازمنہ وسطیٰ میں دھکیل دیا جائے گا۔ مغربی اور مغرب نواز ترکی پریس کا واویلا بے مقصد نہیں ہے بلکہ سازش یہ ہے کہ سیکولرزم کی حفاظت کے نام پر ترکی کی فوج کو وہی کارروائیاں کرنے پر مجبور کر دیا جائے جن کی وجہ سے الجیریا خانہ جنگی کا شکار ہو کر تباہ ہو رہا ہے۔

ایسے نازک حالات میں "رفاہ پارٹی" کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ جذباتیت سے پرے اٹھ کر انہیں ایسے اقدامات اور فیصلے کرنے ہوں گے جن سے اسلام کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے پیش ہو سکے۔ ان کی کامیاب یا ناکام کارکردگی پر نہ صرف ان کا بلکہ ترکی میں بہت حد تک اسلام کے مستقبل کا بھی انحصار ہے۔

ترکی کے انتخابات میں مختلف پارٹیوں کی پوزیشن حسب ذیل رہی۔ موازنے کے لئے 1991ء کے عام انتخابات میں پارٹیوں کی کارکردگی بھی ووٹ فیصد کے لحاظ سے پیش خدمت ہے۔ 1991ء عام انتخابات اور 1994ء میں مقامی انتخابات میں پارٹی پوزیشن بالترتیب یہ ہے۔ ٹروپاتھ پارٹی 27.5 فیصد اور 21.9 فیصد' مدر لینڈ پارٹی 24.5 فیصد اور 20.9 فیصد' ویلفیئر پارٹی 16.9 فیصد اور 18.8 فیصد' ڈیموکریٹک سوشل پارٹی 20.8 فیصد اور 13.4 فیصد' لیفٹ ڈیموکریٹک پارٹی 10.8 فیصد اور 8.7 فیصد' نیشنل ایکشن پارٹی 5.0 فیصد اور 8.1 فیصد اور ری پبلکن پولیٹکس پارٹی 5.0 فیصد اور 4.7 فیصد۔

دجال اور دجالی فتنے کی ایک چشم کشا توضیح

عام آدمی کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی

پوری دنیا خصوصاً مغرب میں غلبہ اسلام کے لئے جو جدوجہد چل رہی ہے اس کے پیش نظر یہ بات کہی جا رہی ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا پر اسلامی پرچم کے لہرانے کا زمانہ شاید قریب آ گیا ہے۔ کچھ معلمین قرآن بھی قرآن کریم کی آیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اسی قسم کی بات کہہ رہے ہیں۔ بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے اور مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے بتدریج معزز ہونے اور عالم اسلام کی جانب سے اسے شرف قبولیت بخشنے کے تناظر میں اس پیش گوئی کے سچ ثابت ہونے کا بھی زمانہ شاید قریب آ گیا ہے کہ قیامت سے قبل مسیح دجال کا ظہور ہو گا۔ موجودہ عالمی حالات اور مغربی ممالک و عالم اسلام میں رونما ہونے والے واقعات کے پیش نظر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ واقعات مسیح دجال کی آمد کا پیش خیمہ تو نہیں ہیں؟ پاکستان کے ایک معروف معلم قرآن ڈاکٹر اسرار احمد کے تجزیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس پر یقین کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں رہ جاتا کہ مطلع عالم پر آفتاب اسلام کے جگمگانے اور پوری دنیا کی فضاؤں میں پرچم اسلام کے لہرانے کا زمانہ شاید قریب آ گیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے بعض حالیہ واقعات کو احادیث کی روشنی میں کچھ اس انداز سے دیکھا ہے کہ عام آدمی کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا کہنا ہے کہ مغرب کا نیا عالمی نظام اسی مسیح دجال کا نظام ہے جس کے کلی قیام کے بعد حضرت مسیح کا ظہور لازم ہو جائے گا۔ قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے کہ یہودی اور عیسائی آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور حمایتی ہیں۔ (المائدہ ۵۱-۵۲) وہ کہتے ہیں کہ دراصل ایک پیش گوئی تھی جو آج کے زمانے میں پوری ہوئی ہے ورنہ (بعضهم اولياء بعض) کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ اس سے قبل عیسائیت کی پوری دو ہزار سالہ تاریخ کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں میں مسلسل دشمنی رہی ہے چنانچہ پہلے تین سو سال تک یہودی اور رومی دونوں نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں اور جب چوتھی صدی عیسوی میں رومی سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی تو اس کے بعد سے مسلسل یہودیوں پر عرصہ حیات تنگ کرتے رہے یہاں تک کہ خود بیسویں صدی کے وسط میں نازی جرمنی کے عیسائیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو نیست و نابود کیا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ خود جس وقت قرآن کی یہ آیت نازل ہو رہی تھی اس وقت اور اس کے بعد بھی فی الواقع عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان دوستی موجود نہیں تھی لہٰذا (بعضهم اولياء بعض) کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک پیش گوئی تھی جو آج کے زمانے میں پوری ہوئی اور اس کا تکمیلی مرحلہ حال ہی میں ڈرامائی انداز میں سامنے آیا ہے جب پوپ کے ایک فرمان کے ذریعے ساڑھے انیس سو سالہ تاریخ بدل دی گئی اور وہ یہودی قوم جو خدا کے صلبی بیٹے کو سولی دینے کی مجرم قرار دی جاتی تھی یک جنبش قلم بری قرار دی گئی پھر چند ہی ہفتے قبل خبر آئی کہ ویٹی کن (Vatican) نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کا سفارت خانہ بہت جلد یروشلم میں قائم ہو جائے گا اور یہ تو کچھ ہی دنوں قبل کی بات ہے کہ اسرائیل کے وزیراعظم اسحاق رابن نے واشنگٹن سے واپسی پر پاپائے روم اعظم سے ملاقات کی اور انہیں اسرائیل کا دورہ کرنے کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ کوئی چیز یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ اس کی حفاظت تین ہزار برس تک تو ہم نے کی ہے اب یہ آپ کے حوالے ہے اور آئندہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دجال کے عالمی نظام کی تکمیل میں اب تک جو خطہ سب سے زیادہ مزاحم ثابت ہو رہا تھا وہ مسلمانوں پر مشتمل مشرق وسطیٰ کا وہ علاقہ تھا جسے اب عرب و اسرائیل امن مشن کے نام پر فتح کر لیا گیا ہے اور یہ بات محض اتفاق نہیں ہو سکتی کہ اس سلسلے کی امن کانفرنس تہذیب حجازی کے مزار اسپین کے دارالخلافہ میڈرڈ میں منعقد ہوئی۔ دجال کے اس عالمی نظام کی قیادت بظاہر اس وقت امریکہ کر رہا ہے جسے دراصل اس وقت یہودیوں کی سیاسی قوت کے اعلامیے کی حیثیت حاصل ہے۔

نئے دجالی نظام میں ایک اہم رول اقوام متحدہ بھی ادا کر رہا ہے جو دراصل اسرائیلی مفادات کا ہی محافظ ہے اور جس پر اسرائیل کی گرفت سخت ہے۔ واضح رہے کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل بطروس غالی کو اپنی نامزدگی سے قبل اور امریکی صدر سے بھی ملاقات سے قبل اسرائیلی وزیراعظم کی رضامندی حاصل کرنی پڑی تھی۔ پھر امریکہ کا پورا وجود ہی اسرائیل کی حفاظت و سرپرستی کے لئے قائم ہے جس کا اظہار جنرل شورز کراف نے کیا تھا' جنگ کے فوراً بعد اس نے کہا تھا کہ ہم نے یہ جنگ صرف اسرائیل کے تحفظ کے لئے لڑی ہے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ امریکہ کے سابق صدر کی کتاب "سیزدی مومنٹ" خلیج کی جنگ کے بعد شائع ہوئی۔ اس میں بھی انہوں نے لکھ دیا کہ اسرائیل کی حفاظت ہماری خارجہ پالیسی کا اہم ترین جز ہونا چاہئے۔

امریکہ کی قیادت میں نئے عالمی نظام کا نعرہ دراصل فتنہ دجالیت کا نقطہ عروج اور المسیح الدجال کے ظہور کی تمہید ہے جس میں دراصل اصل عامل کی حیثیت تو یہودیت کو حاصل ہے البتہ پورا عالم عیسائیت بھی یہودیت کا شریک اور آلہ کار ہے گویا امریکہ ہو یا برطانیہ' فرانس

اور اقوام متحدہ ہو یا "جی سیون" سب صیہونیت کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔

پھر قرآن کے ارشادات اور احادیث نبوی میں المسیح الدجال کے متعلق تفاسیر کی روشنی میں نئے صیہونی عالمی نظام کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہئے۔ یہودی خود کو خدا کی پسندیدہ قوم سمجھتے ہیں اور دوسرے تمام انسانوں کو انسان نما حیوان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ان کے معاشی استحصال کو اپنا قانونی اور اخلاقی حق سمجھتے ہیں چنانچہ صدیوں کی مساعی کے نتیجے میں انہوں نے سود پر مبنی نظام بینک کاری اور سونے چاندی کے سکوں کے بجائے پیپر کرنسی کو رواج دیا۔ دوسری جانب کاروباری اور صنعتی حصص کی کاغذی دستاویزات اور اسٹاک ایکسچینج پر مشتمل ایک ایسا عالمی و مالیاتی نظام قائم کیا ہے جو اب پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے اور ان کے لئے ممکن ہے کہ جب چاہیں جہاں چاہیں مالیاتی نظام میں زلزلہ پیدا کر دیں۔ چنانچہ آج کے یہودیوں کے زیر کنٹرول ادارے' ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف نہ صرف پوری دنیا کو کنٹرول کر رہے ہیں بلکہ اس طرح اپنی دجالی تہذیب کو بھی پوری قوت کے ساتھ دنیا میں جاری کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ امریکہ کے ایک ڈالر کے نوٹ پر واقعتاً اہرام مصر کی تصویر طبع ہوتی ہے اور اس کے نیچے "نووس اور ڈوسیکلورم" کے الفاظ ہوتے ہیں جو گویا نیو ورلڈ کے نظام کے قیام کی عکاسی کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر معنی خیزیات یہ ہے کہ اہرام کی تصویر کے بالائی حصے میں ایک آنکھ بنی ہوئی ہے جو دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کی تفسیر ہے کہ دجال یک چشم ہو گا۔

ایک دوسری دلچسپ بات بائبل کی آخری کتاب مکاشفات یوحنا کے سترھویں باب میں درج ہے اس باب میں ایک ایسے عظیم اور خونخوار درندے کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے سات سر ہیں اور دس سینگ اور اس پر ایک عورت سوار ہے۔ یہ درندہ خود بھی مجسم کفر اور الحاد ہے اور اس پر سوار عورت بھی سرتاپا بدکاری کا نمونہ ہے۔ مکاشفہ کے مطابق اس درندے کا مقابلہ ایک میمنہ سے ہو گا جو اسے ہلاک کر دے گا۔ حکمت ایمانی سے ادنیٰ ترین مناسب رکھنے والا شخص بھی فوراً پہچان لے گا کہ یہ اصل فتنہ دجال کی تعبیر ہے۔ چنانچہ درندے سے مراد عہد حاضر کے خوفناک ہتھیاروں سے لیس مغربی ممالک ہیں جن کے جسد واحد ہونے کا ثبوت خلیج کی جنگ میں واضح ہو کر سامنے آچکا ہے اور کیا عجب کہ سات سروں سے مراد آج کے جی سیون ہوں اور ان کے سروں پر وہ بدکار عورت سلطنت اسرائیل ہے جس کی حفاظت کے لئے یہ تباہ کن جنگ لڑی گئی تھی اور رہا وہ میمنہ جو اس عفریت کو ہلاک کرے گا وہ دراصل حضرت عیسیٰؑ جیسے بے ضرر اور رقیق القلب انسان کی تعبیر ہے جن کی آمد کے عیسائی اور مسلمان دونوں منتظر ہیں اور جن کے ظہور کا شاید وقت قریب آچکا ہے۔OO

(بشکریہ ملی ٹائمز انٹرنیشنل' نیو دہلی ۳۰ نومبر ۹۴ء)

نئے صوبوں کے مسئلے پر ڈاکٹر طاہر القادری کی رائے

"پاکستان عوامی تحریک کے سربراہ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری نے ایم۔کیو۔ایم کے قائد الطاف حسین کی جانب سے مہاجر صوبے کے قیام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ لسانی بنیادوں کی بجائے انتظامی بنیادوں پر صوبوں کی تقسیم سے تعصبات بڑھیں گے۔ پروفیسر طاہر القادری نے صوبہ سندھ' پنجاب' بلوچستان اور سرحد کے صوبوں کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ملک بھر کے تمام ڈویژن کو فی الفور صوبہ کا درجہ دے دیا جائے تاکہ اختیارات کے ایک جگہ ارتکاز سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا جاسکے اور مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں سے امتیازی سلوک کا خاتمہ بھی ہو سکے۔ وہ مرکزی سیکریٹریٹ سے ٹیلی فون پر ناظم نشرواشاعت ابو مجاہد سے گفتگو کر رہے تھے۔ پروفیسر طاہر القادری نے ترقی یافتہ و ترقی پذیر ممالک کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ رقبہ کے لحاظ سے پاکستان سے چھوٹے کئی ممالک انتظامی سہولتوں کے لئے کئی صوبوں پر مشتمل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ صوبوں کی انتظامی بنیادوں پر تقسیم اور سندھ بلوچستان سرحد کے ناموں کا خاتمہ احساس محرومی اور تعصب کے خاتمے کا موثر ذریعہ ہو گا۔"

(ماخوذ از روزنامہ جسارت کراچی---- فرائڈے ایڈیشن)

نظام کی تبدیلی کا اپنا اپنا انقلابی طریق کار

☆ پروفیسر ڈاکٹر طاہر القادری

تحریک منہاج القرآن کے سربراہ

اور

☆ مولانا عطاء المحسن بخاری

مجلس احرار اسلام کے سربراہ

تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام ایک خصوصی اجتماع میں بیان فرمائیں گے

یہ خصوصی اجتماع ۱۱/ جنوری بروز بدھ بعد نماز مغرب قرآن آڈیٹوریم' اتاترک بلاک' گارڈن ٹاؤن لاہور میں منعقد ہو گا۔

مذاہب و مسالک کا ارتقاء اپنی الگ تاریخ رکھتا ہے

مغرب نے ان سے ابہام پیدا کرنے کا کام لیا

اسلام کے آفاقی پیغام کو قرآن حکیم کی وساطت سے عام کرنا ہوگا

خلیج کے ایک عرب دانشور باسم عجمی کے خیالات پر سردار اعوان کا مختصر تبصرہ

"سوویت یونین کے خاتمے اور کمیونزم کی پسپائی کے بعد مغرب میں یہ احساس شدت سے ابھرا ہے کہ اسلام مغربی اقدار اور مفادات کے لئے بڑا چیلنج بنتا جا رہا ہے۔ اسی طرح مسلم دنیا کے کئی حصوں میں مغرب کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان دشمن ہے۔ مسلم دنیا اور مغرب کے درمیان یہ کشیدگی کوئی نئی نہیں، مگر موجودہ صدی میں یہ کشیدگی بڑی حد تک پس منظر میں رہی۔ امریکہ پہلی عالم جنگ سے قبل اپنے براعظم میں محصور ایک طاقت تھی جس کا یورپ سے کوئی خاص سیاسی اور انتظامی تعلق نہیں تھا۔ اس کے علاوہ عالمی معاملات میں بھی امریکہ تقریباً لاتعلق ہی تھا۔ اس وقت اسلامی معاملات میں برطانیہ یورپی نمائندے کے طور پر بطور خاص ملوث تھا۔

آج تک یورپ بمشکل کسی مذہب کو تسلیم کر سکا ہے۔ اس وقت بھی جب یورپ میں عیسائیت کے تمام فرقے باہم دست و گریباں تھے اسلام ایک منفی مذہبی ترغیب متصور ہوتا تھا اور ہر قیمت پر اس کی مخالفت کی جاتی تھی۔ دوسری جانب جس وقت اسلام اور مغرب کی آویزش اپنے عروج پر تھی، اسلام میں رواداری کی روایت قائم تھی۔ عیسائیوں کے مختلف فرقے مسلم ممالک کی سرزمین پر پناہ گزیں ہونے میں عافیت محسوس کرتے تھے بلکہ اکثر تو اہم سرکاری مناصب تک پہنچ جاتے تھے۔ خاص طور پر یورپی یہودی عیسائیوں کے مظالم سے بھاگ کر مسلم ممالک میں آتے تھے اور انتہائی محفوظ زندگی گزارتے تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۴۹۲ء میں جب اسپین پر دوبارہ عیسائیوں کا قبضہ ہوا تو یہ مسلمانوں کی شکست کی ابتدا تھی مگر اسی دوران مسلمانوں نے یورپ کے دیگر علاقوں اور ہندوستان میں کچھ فتوحات بھی حاصل کیں۔ یعنی اسپین سے بے دخلی کے ایک سال بعد ہی قسطنطنیہ جو کہ عیسائیت کا بڑا گڑھ تھا مسلمانوں کے زیر تصرف آ گیا۔ قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے قبضے نے پورے یورپ میں تشویش کی لہر دوڑا دی۔

قسطنطنیہ کی فتح کے تین عشروں کے اندر اندر ہی اسلامی افواج ویانا اور جنوبی اٹلی تک پہنچ گئیں۔ اس صورت حال نے اہل یورپ میں یہ خوف پیدا کر دیا کہ کہیں قسطنطنیہ کی طرح روم (جو کہ پاپائیت کا مرکز تھا) بھی مسلمانوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ اسی اثناء میں مشرقی دنیا میں بھی مسلمان اپنی گرفت مضبوط کر رہے تھے۔ ۱۵۲۶ء میں شمالی ہندوستان پر مغلیہ اقتدار قائم ہو گیا۔ اس سے قبل ہندوستان میں کئی مسلم ریاستیں پہلے سے ہی قائم تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں تھیں۔ ان تمام ریاستوں کو کابل سے آنے والے حکمران ظہیر الدین بابر نے متحد کیا۔ اس طرح مسلم حکومت ہندوستان میں بلوچستان سے بنگال تک پھیل گئی۔ یورپ میں صرف مسلمانوں کی فوجی طاقت کا ہی خوف نہ تھا بلکہ وہ مسلمانوں کی ثقافتی برتری اور معاشی معاملات میں توازن کی پالیسی سے بھی خائف تھے۔ یورپی سیاح جو کہ مشرق کے بارے میں معلومات کا واحد ذریعہ تھے، وہ مشرق کی دولت اور وہاں کی اعلیٰ معاشرتی اقدار کی کہانیاں سناتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جس وقت یورپ پسماندگی کا شکار تھا اور باہمی تنازعات میں الجھا ہوا تھا اور اس کے علوم اور سائنسی معلومات مسلمانوں کی مرہون منت تھیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان اس قدر طاقتور تھے اور ان کی علمی اور ثقافتی برتری قائم تھی تو کیوں انیسویں صدی کے اختتام تک وہ یورپی اثرات کے تابع آ گئے۔ نیز وہ رواداری جو مسلمانوں کا خاصہ تھی کینہ پروری اور دہشت گردی کے الزامات میں کیونکر تبدیل ہو گئی؟۔

صدیوں سے محققین قوموں کے عروج و زوال کے اسباب تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ اکثر محققین جغرافیائی حالات، موسمی اثرات، معاشی و سماجی ترتیب اور سیاسی و ثقافتی اثرات کو وجہ کے طور پر پیش کرتے ہیں جو ان تغیرات کا پیش خیمہ بنتے ہیں۔ مگر وہ اس بات پر بھی متفق ہیں کہ کسی قوم یا قبیلے کی کامیابیاں کسی لگے بندھے کلئے کے تحت نہیں ہوتیں۔ اکثر یہ عمل اچانک اور تحیر آمیز ہوتا ہے۔ مثلاً ساتویں صدی تک کون کہہ سکتا تھا کہ صحرائے عرب کے قبائل جو کسی بھی طرح قابل ذکر اہمیت نہ رکھتے تھے ایک دم اس قدر منظم اور طاقتور ہو جائیں گے کہ ایران اور بازنطینی شہنشاہیت کو اکھاڑ پھینکیں گے اور ٹھیک دس صدیوں بعد غیر مہذب اور اجڈ کا شکار یورپ پوری دنیا کو فتح کر لے گا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عربوں کی کامیابوں کے پیچھے اسلام کا جذبہ کارفرما تھا جبکہ یورپ کی ترقی کا راز معاشی محرکات میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ مسلم طاقت میں انحطاط کے بھی دو بنیادی اسباب ہیں، یعنی یورپ کا سامراجی رجحان اور پیش قدمی، دوسرے مسلم معاشرے میں اسلام سے روگردانی جس نے دنیا فتح کرنے کا جذبہ رکھنے والی ملت کو تباہی کی راہ پر گامزن کیا۔

انیسویں صدی کے وسط تک تمام مسلم معاشرے یورپ کے سامنے انتہائی کمزور پڑ چکے تھے۔ پوری مسلم ملت میں ایک بحث کا آغاز ہوا کہ اس صورت حال سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے۔ یہ بحث جو خصوصاً سیاسی نوعیت کی تھی اور جس کا مرکز

کا باعث بنے گی۔ اس نے ان ترقیاتی کاموں کی پر امن افادیت کی بھی تعریف کی۔ اس نے محسوس کیا کہ سائنسی جدت طرازی تمام دنیا کے انسانوں کو قریب تر لانے کا بھی باعث ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے ملک میں مغربی تقلید کی سفارش کی۔ اس نے کہا کہ مصری' یورپین عوام کو اپنے ملک میں بلائیں تاکہ ان سے جدید علوم سیکھے جا سکیں۔

اس کے برعکس جمال الدین افغانی نے مغرب اور مغربی تہذیب کی مخالفت کی گو کہ وہ بھی اسلامی دنیا میں اصلاحات کا حامی تھا۔ اس کی بنیادی دلیل یہ تھی کہ مسلمانوں نے علم و صنعت کے میدان کو چھوڑ دیا ہے حالانکہ انہوں نے پوری دنیا کو علم سکھایا ہے۔ پوری مسلم دنیا میں افغانی کے بے شمار ماننے والے تھے لیکن اپنی بے لاگ گفتگو اور اصلاحات کی حمایت میں دلائل نے حکمرانوں کو اس کے خلاف کر دیا۔ اس بحث نے برطانیہ کو اپنی جانب متوجہ کر لیا کیونکہ مسلم دنیا سے برطانیہ کے بے حساب مفادات وابستہ تھے' دیگر یہ کہ دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی اس کی عملداری میں تھی جو کہ عثمانیہ سلطنت سے بھی بڑی تھی۔ چنانچہ اگست ۱۸۳۷ء میں دفتر خارجہ نے ایک سرکلر تمام برطانوی سفارت کاروں کو (جو کہ عثمانیہ خلافت میں فرائض انجام دے رہے تھے) بھیجا کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں مشاہدہ کریں کہ عوام میں کسی قسم کی مذہبی یا سیاسی احیاء کی کوئی تحریک تو پروان نہیں چڑھ رہی۔ یہ مغربی طاقتوں کا پہلا ردعمل تھا جو مسلم دنیا میں ہونے والے مباحث کا نتیجہ تھا۔

اناطولیہ کے قونصل نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ جس طرح ایک عیسائی اس خطے میں آزادانہ زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی عبادات بلاخوف و خطر ادا کرتا ہے' اس سے مسلم معاشرے کی رواداری کا ثبوت ملتا ہے جو کہ مہذب عیسائی ممالک میں ناپید ہے۔ گو کہ کچھ انفرادی طور پر عیسائیت کے خلاف اپنی تشویش کا ضرور اظہار کرتے ہیں۔

دمشق کے قونصل نے لکھا کہ انتظامیہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ مذہبی جذبات ابھار رہی ہے تاکہ وہ اصلاحات کے مزاحم قوتیں پیدا کر سکے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو مختلف محکموں میں عیسائیوں پر سبقت دی جا رہی ہے۔ افسران خود کو متقی ثابت کرنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں اور اسلام کی برتری اور سربلندی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ عیسائیوں کو اعلیٰ عہدوں سے سبکدوش کیا جا رہا ہے۔ اس سے ہوا کے رخ کا تعین کیا جا سکتا ہے کہ حالات کس جانب رواں دواں ہیں۔ اس کے تجزیئے کے مطابق خطرہ احیائے دین کی تحریکوں سے نہیں بلکہ انتظامیہ کے اعلیٰ اہلکاروں کی مبالغہ آمیز مذہبی جذبات نگاری کے باعث پیدا ہو رہا ہے۔ قونصل کا خیال تھا راسخ العقیدہ مسلمان خطرناک نہیں ہے بلکہ وہ متعصب اور خود نما مسلمان خطرے کا باعث ہے جو اپنی لغزشوں کو چھپانے کے لئے تعصب کا سہارا لیتا ہے۔ کسی عقیدے کے ماننے والے کے نظریات قابل برداشت ہوتے ہیں جو اپنے مذہب کی عظمت کا خواہاں ہوتا ہے۔ مگر وہ مفاد پرست جو لبادہ اوڑھ کر مفادات کا بچاؤ کرتا ہے نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

یروشلم کے قونصل نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ مذہبی جذبات نابلس' ہیبرون اور غزہ میں قوی ہیں مگر وہ ان مقامات پر مذہبی عصبیت کی موجودگی سے انکاری تھا۔ اس کے مطابق غیر متعصبانہ ماحول کا سبب مسلمان اور عیسائی افراد کا باہمی میل ماحول تھا۔

سوئیز کے قونصل نے لکھا کہ یہاں کے لوگ قاہرہ اور استنبول کی بجائے حجاز کی جانب رجوع کرتے ہیں تاکہ وہاں سے فلاح پا سکیں۔ اس کے علاوہ مذہبی اہمیت کا احساس لوگوں میں پیدا ہو رہا ہے جو کہ مغربی اثرات کا ردعمل ہے۔ اس نے تجویز پیش کی کہ مذہبی جذبات کو بھڑکنے سے روکنا چاہئے اور جاہل آدمی کے ذہن سے جنون پرستی کے اثرات کو کم کرنا چاہئے۔

پچھلی عالمی جنگ میں مسلم دنیا پوری طرح ملوث ہو گئی اور علماء نے اعلان جہاد کر دیا تھا۔ خاص طور پر ہندوستان جہاں تقریباً ۷ کروڑ مسلمان بستے تھے۔ ہر مسلمان روحانی طور پر ترکی سے منسلک تھا۔ مگر سیاسی ہمدردیاں برطانیہ کے ساتھ تھیں۔

برطانیہ نے صورت حال کا فوری جائزہ لینے کیلئے رکن پارلیمنٹ مارک سائی کیز (Mark Sykes) کو متعین کیا۔ اپنی رپورٹ میں سائی کیز نے لکھا ہے کہ ہندوستانی اسلام کی بنیادی تعلیمات سے بے بہرہ ہونے کے باعث ترکی کی حمایت کر رہے ہیں۔ اس نے نومبر ۱۹۱۵ء میں ایک خفیہ میمورنڈم میں تجاویز پیش کیں کہ برٹش انڈین حکومت مسلمانوں کے لئے ایسا نصاب تیار کرے جس میں اسلام کی بنیادی تعلیمی اور تاریخی اہمیت اجاگر ہو سکے۔ اس کے علاوہ دینیات اور تاریخ کا خصوصی مطالعہ شامل ہونا چاہئے۔ اس نے یہ بھی تجویز کیا کہ عظیم حکمرانوں کے تاریخی کارنامے شریعت کے ارتقاء کے اصول بھی نصاب کا حصہ ہونا چاہئے۔

اس نے غریب طبقات میں اسلامی تاریخ کی بنیادی باتیں پڑھانے پر زور دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح صحیح مذہبی جذبات اور عقیدہ غریب طبقات میں پیدا ہو گا اور بالادست طبقات میں وسیع خیالات جنم لیں گے جو ان کے مذہب کی سچی اہمیت کو اجاگر کریں گے۔ سفارت کاروں نے مسلم دنیا کے بارے میں جو رپورٹنگ کی۔ ذرائع ابلاغ نے اسلام کے بارے میں اس سے متضاد تبصرہ کیا۔

مغربی مورخین نے سب سے زیادہ ابہام پھیلایا۔ انہوں نے اسلامی اصطلاحات کو غلط استعمال کر کے تاریخ کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اسی طرح ایک اصطلاح "پان اسلام ازم" کی بھی ہے جو عام طور پر جنگجو اسلام (Militant Islam) کی شکل پیش کرتی ہے۔ پان اسلام ازم کی اصطلاح سب سے پہلے ۲۹ دسمبر ۱۸۸۱ء کو ٹائمز نے ترکی کی اسلامی پالیسیوں پر اپنے ایک مضمون میں استعمال کی۔ یہ ایک تنقیدی مضمون تھا جو یورپ سے ترکوں کی مخاصمت کے خلاف لکھا گیا تھا۔ اس سے قبل فرانسیسی رسائل نے عثمانیہ خلافت پر اپنے مضامین میں اظہار کیا تھا۔ یہ مضامین مسلمانوں کے ان جذبات پر تنقید تھے جو فرانس کے ٹیونس پر قبضہ کے خلاف مسلمانوں میں پیدا ہوئے تھے۔ جنوری ۱۸۸۳ء میں یہ اصطلاح پھر ایک مضمون میں استعمال کی گئی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ پان اسلام کی تحریک کو نئی صلیبی جنگ کے ذریعہ کچل دیا جائے۔ اس مضمون کے چونتیس (۳۴) سال بعد جنرل ایلن بائی' یروشلم میں داخل ہوا اور جنرل گورارڈ دمشق میں' دمشق میں داخل ہوتے ہی وہ صلاح الدین ایوبی کے مزار پر پہنچا اور کہا کہ "ہم واپس آ گئے ہیں"۔

شروع سے ہی اسلام یورپ کے لئے تشویش کا باعث رہا ہے جبکہ گذشتہ دو صدیوں سے وہ خم ٹھونک کر اس سے نبرد آزما ہیں۔ اسلام کے بارے میں یورپ کی معلومات کا ذریعہ سیاح اور تاجر رہے ہیں۔ جنہوں نے مسلم ریاستوں کی وسعت اور دولت مندی کی کہانیاں اہل یورپ کو سنائیں۔ اس طرح اسلام کے بارے میں رومانی تصور اجاگر کیا۔ خاص طور پر سند باد جہازی' الہ دین' صلاح الدین اور عمر خیام کی رومان پرور حکایتوں نے مسلم ثقافت کو متعارف کرایا۔ یوں صحیح مسلم عقیدے پر کسی نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ ۱۷۹۸ء میں یورپ کے اسلام کے بارے میں تبدیلی کا سال تھا۔ نپولین نے مصر پر حملہ کیا اور اپنی فوج کے ساتھ علماء کا ایک گروہ بھی لایا جو مشرق پر

بھرپور علم رکھتے تھے۔ اسکندریہ کی بندرگاہ پر اس نے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ بھی مسلمان ہے۔ حالانکہ اسے اسلام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسی طرح مجمع نے بھی اس کے اعلان کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اس کا اصل مقصد اسلامی دنیا کو مطیع بنا کر ہندوستان میں برطانوی اختیار کو چیلنج کرنا تھا۔ گو کہ نپولین کا مشن ناکام رہا مگر اسلام کے معاملات میں اس کی دلچسپی نے یورپ میں اسلام کے بارے میں نئے رجحانات کا آغاز کیا۔ اس سے قبل یورپ اسلام اور مسلمانوں کے پس منظر اور ان کی سیاسی ثقافت کا مطالعہ کرتا تھا۔ اب علمی طور پر ان کے مذہبی عقائد اور روحانیت کا بھی مطالعہ کرنے پر مجبور ہوا۔ مگر نو آبادیاتی ذہنیت نے یورپ کی برتری اور مشرق کی کمتری پر اصرار جاری رکھا۔ وہ یہ تصور رکھتے تھے کہ ان کے پاس جدید ٹیکنالوجی ہے اور طاقت ہے لہٰذا مشرق کو اپنی مرضی کے مطابق سدھار سکتے ہیں۔ یہاں ایک دلچسپ صورت پیدا ہوئی کہ جس وقت علماء اور زعماء اسلام میں اصلاحات پر بحث کر رہے تھے تو بعض مستشرقین اسلام میں قدامت پرستی پر زور دے رہے تھے اور اصلاحات کے خلاف دلائل دے رہے تھے۔ دراصل ان کے ذہن میں مغرب کی برتری اور مسلمانوں کی کمتری کا تصور موجود تھا۔

موجودہ دور میں کچھ مغربی مفکرین نے متعصبانہ انداز فکر کے برخلاف مسلمانوں اور عربوں کی معروضی حالات کے تحت بھی منظر کشی کی۔ ان میں گب (H.A.R Gibb) شامل ہیں۔ گب (Gibb) اس صدی کا ایک انتہائی اہم مستشرق ہے۔ گب کے مطابق اس سے پہلے کے مستشرقین نے اسلام کے مطالعہ میں عصبیت اور تنگ نظری کا مظاہرہ کیا۔ وہ علمی اور جذباتی حدود سے باہر نہ نکل سکے۔ اس کے مطابق تو اکثر مستشرقین صحیح طور پر مستشرقین تھے ہی نہیں۔ گب مصر کے طٰہٰ حسین کی اس فکر سے اتفاق کرتا ہے کہ اسلام میں جدیدیت کی جبلی صلاحیت موجود ہے۔ ۱۹۴۵ء میں گب نے اپنی معرکہ آرا کتاب (Modern Trend in Islam) لکھی اس کتاب میں اس نے اسلام میں جدیدیت کے سوال پر بحث کی۔ اس کے مطابق رجعت پسند علماء میں وہ دور بینی اور اہلیت نہیں جو مثبت افکار کی مدد سے، نئے تنازعات کو حل کر سکیں۔ اسی سال اس نے اسلام کے مستقبل کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا یہ وہ وقت تھا جب برطانیہ اور فرانس کی جگہ امریکہ نے سنبھالنا شروع کر دی تھی۔

امریکہ کا اسلام سے تعلق زیادہ پرانا نہیں ہے۔ سوائے چند مشنری کام کے جو اس نے شام اور لبنان میں انجام دیئے۔ اس کے علاوہ اس نے ہمیشہ اسلام اور مشرق کے بارے میں عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔ مگر جنگ عظیم دوم کے بعد سے وہ براہ راست عالمی مسائل میں ملوث ہوتا چلا گیا۔ آج یورپ کی تمام علمی شخصیات جو اسلام پر کام کر رہی ہیں امریکہ کی اسلام سے دلچسپی کے باعث امریکہ میں قیام پذیر ہیں۔ امریکہ کی فعال دلچسپی ۱۹۷۴ء کے بعد پیدا ہوئی جب عرب ممالک نے تیل بند کر کے اس کے مفادات کے لئے خطرہ پیدا کیا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امریکی اور یورپین نقطہ نظر میں بہت نمایاں فرق ہے جو اسلام کے حوالے سے پیدا ہوا۔ یورپ میں اسلام مستشرقین کے ذریعہ متعارف ہوا اور ان کی تحریروں میں نو آبادیاتی انداز فکر پایا جاتا ہے۔ جبکہ امریکہ میں اسلام تیل اور دہشت گردی کے حوالے سے متعارف ہوا کیونکہ تیل پر بندش نے امریکی مفادات پر کاری ضرب لگائی۔ امریکہ میں اسلام کی توجیہہ 'ذرائع ابلاغ' کے ذریعہ کی جاتی ہے جو اسلام کا منفی رخ پیش کرتے ہیں۔ امریکی اخبارات' رسائل اور ٹی وی اسلام کی تاریخ' سیاسی کلچر اور نظریات کو انتہائی توہم پرستانہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جس سے قارئین اور ناظرین کے ذہنوں میں تضحیک آمیز تصور ابھرتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے نظریات میں جو فرق ہے اس کا سبب ان کے مختلف النوع مفادات ہیں جو وہ مسلم ریاستوں میں رکھتے رہے ہیں یا آج بھی ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں اور مغرب کے شورش زدہ تعلقات میں کسی قسم کی جدت یا ندرت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی جو کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے چلے آ رہے ہیں۔ ان تعلقات میں کس قدر سچائی اور کس قدر ابہام ہے۔ یہ سوال ہزاروں تحقیقی کتب میں اٹھایا گیا ہے اور مستقبل میں بھی دلچسپی کا باعث بنا رہے گا۔ اب جبکہ مغرب' بدھ مت اور تاؤ ازم سے روحانیت کا فیض حاصل کرنے کی جانب مائل نظر آتا ہے۔ اسلام کے لئے اس کی عصبیت آج بھی قائم ہے۔ آج بھی یورپین عوام اسلام کے بارے میں بہت کم جاننے کے باوجود منفی رویہ رکھتے ہیں۔

اس صدی کے آخری عشروں میں مسلم معاشروں میں آزاد خیالی کی لہر آئی۔ آزاد خیالی تقریباً تمام دانشوروں اور قوم پرستی کی بنیادی پالیسی ٹھہری۔ اکثر مذہبی علماء نے بھی آزاد خیال روش اختیار کی۔ انہوں نے مغرب کے بعض تصورات کی توصیف کی جنہیں اسلامی تعلیمات سے قریب تر پایا۔ ان کا خیال تھا کہ مغرب کے آزاد فکر ان کے اس اقدام کی حمایت کریں گے مگر ایسا نہ ہوا۔ دراصل مغرب سے آنے والی ثقافتی یلغار کے نتیجے میں اکثر مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی بنیاد سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ اس طرح وہ قدیم ترین روایات کو اپنانے کی سعی کرتے ہیں جو ان کے مطابق ان کی اپنی روایات ہیں۔ اس طرح ایک گہری تلخی جنم لے رہی ہے۔

اس تاریخی پس منظر کو بیان کرنے کا مقصد یہ جتلانا ہے کہ مغرب کے اسلامی دنیا سے تصادم کا سبب اس خطے میں اس کے سیاسی اور معاشی مفادات ہیں۔ مثلاً برطانیہ کے ہندوستان میں جب مفادات تھے تو اس کے لئے خلیج اور کویت کی بڑی اہمیت تھی۔ اب یہی خطے امریکہ کے لئے اہم ہیں۔ مستشرقین' مغربی مورخین اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے اسلام کے بارے میں ابہام پھیلانا اور تاریخ کو مسخ کرنا پرانے سامراجی ہتھکنڈے ہیں جن کا مقصد نہ صرف یورپین عوام کو حقائق سے دور رکھنا ہے بلکہ مسلمانوں میں بھی ذہنی انتشار اور شکوک و شبہات پیدا کرنا ہے۔ مغرب کا یہ رویہ نہ تو خلاف توقع ہے اور نہ ہی ناقابل فہم۔ اصل مسئلہ مسلمان حکمرانوں اور اس کے ساتھ مراعات یافتہ طبقہ کا ہے۔ جنہوں نے اپنے اقتدار کی خاطر پہلے نادانی اور غلط حکمت عملی کے نتیجے میں اسلام کو نقصان پہنچایا اور اب کھلم کھلا مغرب کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس کی مثال حالیہ کاسابلانکا کانفرنس ہے جس میں بنیاد پرستی کو سب سے بڑا خطرہ قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ خطرہ ان نام نہاد مسلمان حکمرانوں کے مفادات کو ہے۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس طرح اسلام کا اصل رخ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلام کا پیغام آفاقی ہے۔ اس میں مشرق و مغرب کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں ہر قسم کے تعصب اور علاقائیت سے بالاتر ہو کر اس پیغام کو دنیا میں عام کرنا ہوگا اور اس کا واحد ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ مغرب اپنی برابری' آزادی اور حق خود اختیاری پر مشتمل جن اقدار کا پروپیگنڈہ کرتا ہے وہ اسلام سے ہی مستعار لی گئی ہیں۔ ان اقدار کو مثبت طور پر اسلام کے عالمی غلبے کے لئے استعمال میں لانا ہوگا۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

سلطنت عثمانیہ تھا' طویل عرصے تک جاری رہنے کے باوجود بے سود رہی۔ ان مباحث میں جدیدیت اور قدامت' مغرب زدگی اور روایت جیسے تقابلی مناظرے ہوتے تھے۔ ان مباحث میں ہر مکتبہ فکر اپنے افکار کو مسلم دنیا کی بقاء سے منسلک کرتا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کا تجویز کردہ منصوبہ ہی عالم اسلام کو اغیار کی دسترس سے نکالنے میں معاون ثابت ہو گا اور یہ بحث آج تک جاری ہے جو شریعت کی تشریح سے متعلق تھی۔ شریعت جو مسلم حیات کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہے اور مسلم قوانین کی ایک دستاویز ہے۔ ان مباحث نے تنازعے کی شکل اختیار کی اور اہل علم دو مکاتب فکر میں منقسم ہو گئے۔ ایک مکتبہ فکر شریعت میں اصلاحات کا حامی تھا جبکہ دوسرا مکتب فکر شریعت میں کسی بھی قسم کے اجتہاد کا مخالف تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کیا ہے اور یہ کس طرح وجود میں آئی۔ اسلام اپنی بنیاد میں قوانین کا مذہب ہے۔ قرآن کی ۱۱۴ سورۃ میں سے تقریباً ایک تہائی تعداد قانونی معاملات اور ضابطہ حیات سے متعلق ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ شریعت ایک مثالی قانونی دستاویز ہے جو تمام جدید دساتیر کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ شریعت صرف طریقہ عبادات کی ہی وضاحت نہیں کرتی بلکہ قانون شراکت و معاہدہ کی بھی وضاحت کرتی ہے اور حکمران اسے بطور قانون سازی استعمال کرتے ہیں۔ قانون وراثت اور خاندان کی بھی شریعت میں وضاحت کی گئی ہے۔ اسلامی قوانین کی تیاری کا اہم ذریعہ قرآن ہے جبکہ سنت رسولؐ دوسرے نمبر پر آتی ہے اس کے بعد اجتہاد اور قیاس آتے ہیں۔ جیسے جیسے اسلامی ریاست میں پھیلاؤ آیا اور مسلمان دیگر مذاہب کے ساتھ براہ راست تعلق میں آئے اور ان کی معاشرت سے سابقہ پڑا تو اسلامی قوانین کو مرتب کرنے کا مسئلہ درپیش آیا۔

اسلامی قانون کی تدوین کا بیشتر کام اجماع اور قیاس کے ذریعے کیا گیا۔ قیاس استخراجی طریقہ ہے جس کے ذریعہ ماہر قانون و شریعت کسی نئے مقدمے میں شریعت کی شرح بیان کرتا ہے اور فیصلہ صادر کرتا ہے جبکہ دوسری جانب "اجماع" اکثریت علماء کا متفقہ فیصلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اجماع وہ طریقہ قانون سازی ہے کہ جب علماء اور ماہرین قانون قرآن و سنت کو مدنظر رکھتے ہوئے حالات کی ضرورت کے مطابق قوانین کی تدوین کریں۔ اس سلسلے میں یہ شرط عائد ہے کہ اجماع کے عمل میں شریک علماء کو قرآن و حدیث پر مکمل عبور ہونا چاہئے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ تقریباً ۵۰۰ مکاتیب فکر' شریعت کی تدوین کے کام میں مصروف رہے ہیں۔ مگر سنی فکر میں چار مکاتیب فکر کو چھوڑ کر باقی سب کو رد کر دیا گیا۔ یہ چاروں مکاتیب حنفی' مالکی' شافعی اور حنبلی ہیں۔ ان مکاتیب فکر سے مختلف ادوار میں مختلف فکری رجحانات نے بھی جنم لیا۔ جیسے "وہابیت" جس کا مرکز نجد تھا۔ شیعہ فرقہ کو ماننے والے اصحاب امام جعفر صادق کے مرتب کردہ شرعی قوانین کی پیروی کرتے ہیں جسے فقہ جعفری کہا جاتا ہے۔ شیعہ مسلک میں بھی کئی گروہ پائے جاتے ہیں جن میں اسماعیلی مسلک بہت اہم ہے۔

مذہب ــــــــ ایک تیکنیکی اصطلاح ہے جو کسی نقطہ نظر یا رائے کو ظاہر کرتی ہے۔ کوئی مذہب اس وقت تک قائم رہتا ہے جب تک کہ وہ مخالف افکار کے خلاف اپنی منطقی رائے کا دفاع کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ چنانچہ ایک مذہب اس کے ماننے والوں میں قبولیت تک ہی زندہ رہتا ہے۔ ۱۲۶۷ء میں مصر کے مملوک حکمرانوں نے چار جج (قاضی) مقرر کئے جو سنی فقہ کے چاروں مکاتیب کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس طرح اسلامی فقہ کے ان چار مکاتیب فکر کے علاوہ باقی سب مذاہب کو نظرانداز کر دیا گیا۔ یوں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس عمل کے نتیجے میں غور و فکر کا راستہ بند ہو گیا۔

اسلامی دنیا کے مختلف خطے مختلف مذاہب (مسالک) کے زیر اثر اپنے عقائد کی تکمیل کرتے ہیں۔ مصر اور عراق میں چاروں فقہی مکاتیب فکر کو تسلیم کیا جاتا اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شریعت کسی سرکاری حکم نامے کے ذریعے نافذ نہیں کی گئی بلکہ اس کا ارتقاء چھ سو سال میں ہوا۔ جب مسلمان دیگر مذاہب' ثقافتی اور سماجی گروہوں کے ساتھ رابطے میں آئے اور ان کی ثقافت' روایات اور علم کے مسلمانوں پر اثرات بھی پڑے۔ جس زمانے میں اجتہاد کا دروازہ بند کیا گیا مسلم معاشرہ اپنے بام عروج پر تھا' نہ کوئی مسلم علاقہ کسی بیرونی قابض کے زیر اثر تھا اور نہ کسی مسلم خطے کو کوئی خطرہ تھا۔

ایک دلچسپ صورت حال یہ ہے کہ اس وقت جب کہ شریعت کی تدوین ہو رہی تھی۔ مختلف اقوام' قبیلوں اور دیگر مذاہب کی روایات' رسم و رواج اور اصول قوانین کو اسلامی شریعت میں شامل کیا گیا تھا اور مسلم زعماء نے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں کیا گیا تھا۔ خاص طور پر قانون شراکت اور اصول معاہدہ رومن قانون سے اخذ کئے گئے تھے۔ اسی طرح یونانی' ایرانی اور ہندوستانی قانونی روایات' فلسفہ اور سائنسی اصول اسلامی شریعت میں مدغم کر دیئے گئے۔ اسی طرح شریعت کی وسعت میں اس وقت اضافہ ہو گیا مگر ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھا گیا کہ اسلامی افکار کے منافی کوئی روایت یا اصول شامل شریعت نہ ہو جائے۔ مسلمان حکمرانوں نے سختی کے ساتھ اس اصول کو اپنایا کہ رسم و رواج کے معاملات میں ملوث نہیں ہوں گے' انہوں نے عبادت گاہوں پر خاص توجہ دی مگر غیر مسلموں کے ثقافتی معاملات میں مداخلت نہیں کی۔

اٹھارویں صدی کے آخری عشروں میں سلطنت عثمانیہ جو کہ مسلم طاقت کی علامت تھی اسے مغربی طاقت سے براہ راست خطرہ لاحق ہو گیا۔ گو کہ اس صدی کے شروع میں عثمانی حکمرانوں نے یورپ کی جانب خاصی پیش قدمی کی تھی مگر آخری عشروں تک مسلمان دفاعی حالت میں آ گئے اور یورپ کی بڑھتی ہوئی توسیع پسندی کا شکار ہونے لگے۔ یہ ظاہر ہونے لگا کہ وہ طاقت جو یورپ کے لئے براہ راست خطرہ تھی خود ہی لڑکھڑانے لگی۔ بیرونی مداخلت سے زیادہ اندرونی عوامل اس عظیم سلطنت کی تباہی کا سبب بنے۔

حکمران اشرافیہ میں اعلیٰ سرکاری اہل کاروں کے علاوہ مذہبی راہنما بھی شامل ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ تاجر' فوجی جرنیل' سیاسی راہنما بھی اسی اشرافیہ کا حصہ ہوتے تھے۔ یہ طبقات انتہائی مراعات یافتہ ہوتے تھے چنانچہ اصلاحات ان کے مفادات سے متصادم ہوتی تھیں۔ لہٰذا یہ طبقات انتہائی شدت کے ساتھ ان اصلاحات کی مزاحمت کرتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ اگر کسی سلطان نے اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش بھی کی تو ان بالادست طبقات نے اس سلطان کو معزول کر دیا۔ یہ تمام طبقات اصلاحات کے خلاف شریعت کا سہارا لیا کرتے تھے۔

یہاں ہم مختصراً دو افکار کا جائزہ لیں گے جنہوں نے مسلم سیاست کو متاثر کیا۔ ان میں ایک الفتنوی اور دوسرے الافغانی تھے۔

الفتنوی مصر کے عالم دین تھے جنہوں نے رسمی تربیت جامعہ الازہر سے حاصل کی تھی۔ اس نے یورپ کی ترقی اور کامرانیوں کی توصیف کی اور اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ ترقی انسانی رشتوں میں نئی جہت

ضرورت رائے عامہ کو منظم کرنے کی ہے

محاذ آرائی کی جگہ نئی دھڑے بندی

حالاتِ حاضرہ اور بعض مسائل پر ریٹائرڈ جسٹس محمد افضل چیمہ کی آراء

معاصر ہفت روزہ "تکبیر" کراچی میں چند ہفتے قبل جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا تھا جس کے بعض حصے ہم معاصر عزیز کے شکریہ کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔ ملک کے سنجیدہ اور فہیم عناصر حالات کے تیور دیکھ کر تشویش میں تو مبتلا ہیں لیکن افسوس کہ یہ فکر مندی ہمارے ہاں کسی عملی اقدام کی راہ ہموار نہیں کر رہی۔ شاید مرنے والی اُمتوں کے عالمِ پیری میں اہلِ دانش بھی محض ہاتھ ملتے رہ جایا کرتے ہیں۔۔۔ مدیر

☆ س : چیمہ صاحب' آپ ماشاء اللہ وسیع تجربہ رکھتے ہیں' کچھ فرمائیں گے آج ہم لوگ کہاں کھڑے ہیں؟

○ ج : یہ بڑی دلسوزی کی بات ہے' شاید یہ عمر کا تقاضہ ہو کہ جب میں صبح صبح اخبار دیکھتا ہوں' تو دل دکھ سے بھر جاتا ہے' زبردست ڈپریشن طاری ہو جاتا ہے' دنیا اکیسویں صدی میں داخلے کی تیاریاں کر رہی ہے اور ہم ترقی معکوس کا شکار ہیں۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ ہم داخلی اور خارجی طور پر سنگین نوعیت کے مسائل سے دوچار ہیں۔ خطرات بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ ہم قومی سطح پر شدید قسم کے اخلاقی بحران کا شکار ہیں۔ ہر طرف رشوت' کرپشن' بددیانتی اور حرص و ہوس کا دور دورہ ہے۔ کسی کی عزت' جان' مال آبرو محفوظ نہیں۔ آدھا ملک ہم گنوا چکے ہیں اور باقی سخت انتشار اور محاذ آرائی کا شکار ہے۔ ایک شیطانی چکر (VICIOUS CIRCLE) مسلسل چل رہا ہے۔ جب سیاستدانوں کی بداعمالیاں اور بدعنوانیاں انتہا سے بڑھ جاتی ہیں تو کم تر برائی کے لئے یا نجات کی غرض سے لوگ فوجی حکومت کی دعائیں مانگنے لگتے ہیں۔ فوج آتی ہے تو جمہوریت کی یاد ستانے لگتی ہے۔ فوج کا آنا ہرگز خوش آئند نہیں۔ فوج کا اصل کام دفاعِ وطن ہے۔ وہ سیاسی معاملات یا پبلک ایڈمنسٹریشن میں لوٹ ہو جائے تو اس کی دفاعی صلاحیتیں بھی متاثر ہوتی ہیں۔ جب تک ہم VICIOUS CIRCLE جسے قرآنی اصطلاح میں "دائرۃُ السوء" کہا گیا ہے' سے نہیں نکلتے ہمارے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ہماری شامت اعمال ہے "اعمالکم عمالکم الناس علی دین ملوکم" کے مصداق معاشرہ لامحالہ اپنے حکمرانوں کے رنگ میں بھی رنگا جاتا ہے۔ ملوکیت ختم ہو چکی ہے۔ آج کل ارکان اسمبلی یا سینیٹرز ہی ہمارے ملوک ہیں جو حکمرانی کرتے ہیں۔ انہی میں سے وزیراعظم' صدر' وزراء' وزرائے اعلیٰ وغیرہ کا انتخاب ہوتا ہے اصلاح احوال کے لئے ہمیں ارکان اسمبلی کی اہلیت کے لئے آئین میں دی گئی شرائط پر عمل کرنا ہوگا۔ اگر ہم اس کا اہتمام کر لیں تو ہمارے بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ دوسری ضروری بات یہ ہے کہ امیدوار اور جماعت کی جیت کے لئے پچاس فیصد سے زائد ووٹوں کی شرط ضروری ہو تو بھی اس کا انتظام کیا جائے۔ جمہوری نظام اکثریت کی حکومت پر یقین رکھتا ہے جبکہ ہمارے ہاں اکثر اقلیتیں حکمرانی کرتی ہیں۔ تیسری ضروری بات یہ ہے کہ لاتعداد سیاسی جماعتوں پر بھی قدغن لگائی جائے۔ جب تک کسی جماعت کا ڈھانچہ ملک گیر سطح پر نہ ہو اسے الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت نہ دی جائے۔ چیف الیکشن کمشنر کو وسیع دستوری اختیارات دیئے جائیں۔ اس کا ایک مستقل سیکریٹریٹ ہو۔ پورا اسٹاف ہو۔ یہ اس کی ذمہ داری ہو کہ وہ از خود کاغذات نامزدگی داخل کرانے والے امیدواروں کی اہلیت کو پرکھے اور اپنے آپ کو مطمئن کرے کہ کیا یہ آئینی تقاضے پورے کرتے ہیں۔ اس کے لئے وہ کسی ووٹر یا مخالف کے اعتراض کا انتظار نہ کرے۔ یہ خالصتاً اس کی اپنی ذمہ داری ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں بعض انقلابی اقدامات کرنا ہوں گے۔ میرے نزدیک اتحاد' جہاد' اور اجتہاد تین بنیادی عناصر ہیں۔ اگر اللہ توفیق دے اور ساری قوم میں اتفاق و اتحاد ہو تو ہماری کائنات بدل سکتی ہے۔ اسلامی فقہ کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے میری پختہ رائے ہے کہ کشمیر کی موجودہ صورتحال میں جہاد فرض ہو چکا ہے۔ مجھ پر بھی اور آپ پر بھی۔ اب حکومت پر لازم آتا ہے کہ وہ مصلحتوں اور ضروری تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قوم کو جہاد کے لئے تیار کرے۔ اسی طرح میں ضروری محسوس کرتا ہوں کہ اسلام کے روشن اور ہمہ گیر نظام کو جدید عہد کے بدلتے ہوئے تناظر میں دیکھا جائے اور اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ جب حضور اکرمؐ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر مقرر کیا تو پوچھا کہ آپ فیصلے کس طرح کریں گے؟ انہوں نے جواب دیا "اللہ کی کتاب کی روشنی میں"۔ حضورؐ نے پوچھا "اگر وہاں سے براہ راست رہنمائی نہ ملی تو"۔ حضرت معاذؓ نے جواب دیا۔ "پھر میں حضورؐ کی سنت پر عمل کروں گا۔" حضورؐ نے پوچھا۔ "اگر وہاں سے بھی براہ راست رہنمائی نہ ملی تو" حضرت معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا "پھر میں اپنے ذہن سے سوچوں گا اور اجتہاد کی راہ اپناؤں گا"۔ اس پر حضورؐ بہت خوش ہوئے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ آج اجتہاد کا دروازہ بند ہے اور ہم نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی ہے۔

☆ س : چیمہ صاحب ہر شخص کو اجتہاد کی اجازت بھی تو نہیں دی جا سکتی؟

○ ج : یہ آپ نے درست فرمایا۔ فقہ اسلامی کے تمام ذخائر عربی زبان میں ہیں اور ہمارے ہاں وکلاء اور ارکان عدلیہ عربی نہیں جانتے۔ سپریم کورٹ کے جج کے قلم سے نکلنے والا ہر لفظ قانون بن جاتا ہے اور انہیں بالفعل اجتہاد کی اجازت ہے لیکن عالم یہ ہے کہ ہم عبداللہ یوسف علی کا ترجمہ پڑھ کر قرآن مجید سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فقہ اسلامی کے عظیم ذخائر تک ہماری رسائی نہیں۔ جب میں لاسیکریٹری تھا تو میں نے ایک ورکنگ پیپر تیار کیا تھا کہ اسلامی دنیا کے چوٹی کے فقہاء اور ماہرین قانون پر مشتمل ایک مستقل مجلس تشکیل دی جائے جو عصر نو کے جدید مسائل کے بارے میں اسلامی قوانین کی روشنی میں رہنمائی کرے۔ فقہ کا ایک اصول ہے کہ "احوال و ظروف کے بدلنے کے ساتھ احکام کا بدلنا ناگزیر ہے۔" حضرت عمر فاروقؓ کا عہد اس کی روشن مثال ہے۔ امت مسلمہ میں عالمی سطح پر روشن خیال اور جامع العلوم شخصیات کی ایک مجلس یہ ذمہ داری سنبھال سکتی ہے۔

☆ س : جسٹس صاحب آپ نے سیاسی نظام میں جن تبدیلیوں کا حوالہ دیا ہے کیا وہ موجودہ اسمبلیوں کے ذریعے ممکن ہیں؟

○ ج : مجھے اس کی کوئی زیادہ توقع نہیں۔ رائے عامہ کو ایک زبردست تحریک کے ذریعے منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ جب قوم سیاسی پراگندگی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوگی اور پورے عزم کے ساتھ آئینی تقاضوں پر عملدرآمد کے لئے آواز اٹھائے گی تو صورتحال بدل جائے گی۔ یہ اسمبلیاں کچھ نہیں کریں گی۔ آپ نے دونوں حکومتوں کو دیکھ لیا ہے۔ کسی نے بھی ظفر کراسنگ جیسی لعنت کے خلاف مؤثر قانون سازی نہیں کی۔

☆ س : ایک ماہر قانون کی حیثیت سے کیا آپ ڈی فیکشن کو خلاف آئین خیال کرتے ہیں؟

○ ج : سو فیصد۔ ہمارے آئین کے مطابق اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔ عوامی نمائندے ایک مقدس امانت کے طور اختیارات کام میں لاتے ہیں اس امانت میں خیانت نہیں ہو سکتی۔ ڈی فیکشن کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بڑھ کر امانت میں خیانت کیا ہو سکتی ہے کہ منتخب نمائندہ اپنے ووٹر اور اپنی جماعت کے مینڈیٹ سے بغاوت کر دے۔

☆ س : آپ کے دور کی اسمبلیوں اور موجودہ اسمبلیوں میں کیا فرق ہے؟

○ ج : شاید اس میں خود ستائی کا پہلو نکلتا ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ۱۹۷۲ء کی اسمبلی سب سے مضبوط توانا اور محترم اسمبلی تھی۔ اس وقت پاکستان کی تاریخ کی سب سے طاقت ور منظم اور تجربہ کار اپوزیشن اسمبلی کے اندر موجود تھی۔ سیاسی شعور' قابلیت' جرأت' اصول پرستی اور اخلاقی حوالے سے ارکان اسمبلی کا معیار بہت بلند تھا۔ آج کل اسمبلی کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے اس پر میرے تبصرے کی کیا ضرورت ہے' آپ خود اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم تو ساری دنیا میں جگ ہنسائی کا سبب بن رہے ہیں۔ اس وقت یہ تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہو اور کسی رکن اسمبلی کو جیل میں ڈال دیا جائے۔

☆ س : کیا آپ کے خیال میں عدلیہ کا ادارہ آج بھی اتنا ہی وقیع اور محترم ہے؟

○ ج : یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ ادارے تباہ ہو رہے ہیں۔ اب ہم پرانے رفقاء مل بیٹھتے ہیں تو عموماً قومی مسائل پر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ بڑا دکھ ہوتا ہے کہ زندگی کا ہر شعبہ مسلسل انحطاط پذیر ہے۔ کئی لوگ اپنے دفاع میں میری تقرری کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بھی سیاسی تقرری تھی۔ میرے رفقاء بطور سینئر ڈپٹی سیکرٹری کارکردگی کا حوالہ دیتے ہیں۔ میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا لیکن یہ مان لینا چاہئے کہ وہ مارشل لاء کا دور تھا۔ آپ تو جمہوریت کا دم بھرتے ہیں۔ پھر ایک غلطی کسی دوسری غلطی کا جواز بنتی ہے نہ دو غلط اقدام ایک درست اقدام کے برابر ہوتے ہیں۔ یہ تو کبھی بھی نہیں ہوا کہ پہلی حکومت کے مقرر کردہ ججوں کو کنفرم کرنے کے بجائے گھر بھیج دیا جائے اور درجنوں کے حساب سے اپنے آدمیوں کو بٹھا دیا جائے۔ آخر لوگ سب کچھ جانتے سب کچھ دیکھتے ہیں۔ جس طرح کے لوگ جس انداز میں عدالتوں میں لائے جا رہے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ عدلیہ کے محترم اور وقیع ادارے کا وقار کم ہو رہا ہے۔

☆ س : لیکن چیمہ صاحب عدالتوں میں سیاسی مداخلت اور دباؤ تو ہر دور میں رہا ہے؟

○ ج : میں ایسا نہیں سمجھتا۔ پاکستانی عدلیہ کی تاریخ بڑی روشن ہے۔ ہم نے کبھی مداخلت اور دباؤ کو قبول نہیں کیا۔ ہو سکتا ہے کوئی اکا دکا انفرادی مثال مل جائے لیکن عدلیہ بڑی حد تک آزاد رہی ہے۔ عوام کی نگاہوں میں بھی جرأت مندانہ فیصلے دیئے ہیں۔ جب صدر ضیاء الحق نے PCO کے تحت عدلیہ کے اختیارات کم کرنے اور کچھ ایسے ہی دیگر اقدام کئے تو میں نے انہیں اردو میں ایک خط لکھا۔ اپنے دفتر کے ایک خطاط سے کتابت کرائی اور مولانا ظفر احمد انصاری کے حوالے کیا جو اگلے دن صدر سے ملنے جا رہے تھے۔ دوسرے دن میں نے انصاری صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ خط کی زبان نہایت سخت تھی۔ میں نے وہ صدر کو دینا مناسب نہیں سمجھا۔ بہرحال میں نے خود صدر کو اپنے جذبات سے آگاہ کر دیا تھا۔ اب تو انتہا ہی ہو گئی ہے۔ عدالتیں اسکینڈلز کا نشانہ بنتی جا رہی ہیں۔ ہر کہیں ججوں کو موضوع گفتگو بنایا جا رہا ہے۔

☆ س : میاں نواز شریف کیس میں عدالت عالیہ نے ایک تاریخی فیصلہ دیا لیکن انتظامیہ نے اسے ناکام بنا دیا۔ آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

○ ج : عدلیہ اور انتظامیہ کی کشمکش ہر ملک میں رہی ہے۔ خود امریکہ کی تاریخ میں بھی طویل عرصہ تک یہ کشمکش جاری رہی ہے لیکن جس انداز میں پاکستان کے اندر ملک کی سب سے بڑی عدالت کے فیصلے کو انتظامیہ نے غیر مؤثر بنا دیا اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ گیارہ رکنی بنچ نے یہ فیصلہ ایک کے مقابلے میں دس کی اکثریت سے کیا۔ یہ تقریباً متفقہ فیصلہ تھا۔ اگر فیصلہ ۵-۶ کی نسبت سے ہوتا تو بھی عدالت کے احترام و تقدس کا تقاضا تھا کہ اس کے الفاظ اور روح پر پورا پورا عمل ہوتا جو کچھ ہوا وہ کم سے کم الفاظ میں "ظلم عظیم" ہی کہلا سکتا ہے۔ ایسے ظلم کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملے گی۔ اس کے نتائج ہم آج بھی بھگت رہے ہیں۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ سیاسی عدم استحکام عروج پر ہے۔ قوم بری طرح انتشار کا شکار ہے۔ ہم "سول وار" کے دہانے پر کھڑے ہیں۔ ہمارے دشمن اس صورت حال کو ہوا دے رہے ہیں۔ ہندوستان بھی پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر صدق دل اور خلوص سے سپریم کورٹ کا فیصلہ قبول کر لیا جاتا تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔

☆ س : کیا جماعت اسلامی اور مسلم لیگ میں دوری ملک و قوم کے مفاد میں ہے؟

○ ج : مجھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے قربت کا اعزاز حاصل رہا۔ وہ عظیم فکر کی حامل عالمی شخصیت تھے۔ جن دنوں میں پنجاب اسمبلی کا رکن تھا تو تقریباً ہر روز صبح شام حاضری دیتا تھا اور ان سے ملاقات رہتی تھی۔ میں علمی معیار سے اپنے آپ کو جماعت کے معیار رکنیت کا اہل نہیں سمجھتا تھا لیکن میں ان کی قربت کا شرف ضرور رکھتا ہوں۔ میرا بنیاد جمعیت کا سرگرم رکن رہا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جماعت کو مولانا مودودی نے فکری و ذہنی سرمایہ بھی دیا اور عملی تربیت بھی کی اگر یہ سلسلہ اسی انداز سے بڑھتا رہتا تو جماعت نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کی بہت بڑی قوت بنتی لیکن دکھ اور افسوس کا مقام ہے کہ یہ سرمایہ بھی سلامت نہ رہا۔ ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں جماعت نے جو حکمت عملی اپنائی وہ خود اس کے اپنے پیروکاروں کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ انتخابات سے ۱۵ دن قبل میری ملاقات اسلام آباد کے وی آئی پی لاؤنج میں پروفیسر خورشید احمد صاحب سے ہو گئی۔ میں نے ان سے

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

بقیہ : اداریہ

سے نجات مل جائے گی جو موجودہ صوبوں کے درمیان آبادی کے عظیم فرق و تفاوت نے پیدا کر رکھا ہے اور "مرگ انبوہ جشنے دارد" کے مصداق سندھ کو بھی انگریزوں کی قائم کی ہوئی اپنی پرانی حد بندی کے ٹوٹنے پر کچھ بہت اعتراض نہ ہو گا۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ برسراقتدار جماعت' پیپلز پارٹی کے ایجنڈے میں "ضلعی حکومتوں" کا قیام شامل ہے تو آخر ڈویژنل حکومتوں کی تشکیل میں کیا امر مانع ہے اور ڈویژنوں کی موجودہ حدود میں حسب ضرورت تھوڑی بہت کمی بیشی سے کونسی قیامت آ جائے گی جبکہ قیام پاکستان کے بعد سے یہ کام ہوتا آ رہا ہے۔ نئے ضلعے وجود میں آئے ہیں اور نئے ڈویژن پہلے بھی بنے ہیں' اب ایک ہی دفعہ ان کے رقبوں میں ردوبدل کر کے لگ بھگ ایک ایک کروڑ کی آبادیوں پر مشتمل نئے ڈویژن بنانے اور انہیں صوبوں کی حیثیت دے دینے سے ہمارے بہت سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔

قومی مسائل پر گول مول رائے کے اظہار میں بڑی عافیت ہے لیکن وقت کی ضرورت ہے کہ ان کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے اور پھر قوم کو ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا جائے خواہ اس میں بعض بزعم خود محب وطن عناصر کے غیظ و غضب کو دعوت بھی دینی پڑ جائے۔ مشکلات سے جی چرانا بھی ایک عارضی سہارا تو ہے لیکن اصل حل ان کا پورے شعور و ادراک کے ساتھ مواجہہ کرنے میں ہے اور تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت نے پاکستان کی حکومت اور عوام کو اسی کی دعوت دی ہے۔○○

زبانِ یارِ من ترکی...

ہمارے سُنّی بھائی تو بالکل ہی "سُنّ" ہو کر رہ گئے ہیں

اقتدار احمد

بُرصہ کی "عُلو جامع" میں نمازِ ظہر کا حیرت انگیز منظر

سلطان نے ہٹ دھرم عیسائی بڑھیا کی آخری خواہش پر حرف بحرف عمل کیا

بوڑھے ترک سے ہمارا غائبانہ تعارف تو ظاہر ہے کہ عزے اسے ہمارے پاس لانے سے پہلے ہی کروا چکا تھا۔ ہم نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے السلام علیکم ورحمتہ اللہ کہا تو ہمارے سراپا اور لب ولہجہ نے اسے گویا خرید لیا۔ ساٹھا پاٹھا یہ ترک خلافت کے سقوط کے بعد ہی پیدا ہوا ہو گا لیکن اندازہ ہوا کہ اپنے بزرگوں سے اس نے متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی تحریک خلافت کا حال ضرور سن رکھا تھا اور عجب نہیں کہ علی برادران کی کوئی تصویر بھی اس کی نظر سے گزری ہو۔ محمد علی جوہر اور شوکت علی کے سے جلیئے کے ہم دو بھائی آنکھوں کے رستے اس کے دل میں اُتر گئے جن کے نام ان کی اماں کی ایک فرمائش خبیر سے راس کماری تک پورے برصغیر میں گونجتی رہی تھی --- "جان بیٹا خلافت پہ دے دو"---- عزے کی "نام نہاد" ترجمانی کے ذریعے اس سے ابتدائی گفتگو ہوئی اور ہم نے اپنا مسئلہ اس کے سامنے رکھا کہ چند گھنٹوں کے مہمان ہیں اور شہر کے قابلِ دید مقامات کی سیر کرنا چاہتے ہیں تو بوڑھے نے کہا کہ مسجدِ اکبر (علو جامع : Ulo Cami) اور ترکانِ عثمانی کے جدِ امجد غازی عثمان کا مقبرہ (عثمان غازی تربسی) ضرور دیکھ لینا جس نے عثمانی سلطنت کی بنیاد رکھی "لیکن اس سے پہلے آپ لوگوں کو میرے گھر چل کر ماحضر تناول کرنا ہو گا"۔

اس پُرخلوص دعوت کو قبول کر لینے میں ہمیں کیا عذر ہو سکتا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہمیں بہرحال کھانا تھا' بوڑھے ترک کے گھر جاتے تو بود و باش کا مقامی انداز دیکھنے کو ملتا جس میں مغربیت کی آمیزش کم اور مخصوص ترک مشرقیت کا عنصر یقیناً زیادہ ہوتا کیونکہ بُرصہ کے عمومی ماحول میں ہی نسبت و تناسب کا یہ توازن استنبول سے بہت مختلف اور نمایاں تھا۔ پھر ہوٹلوں کے ترکی کھانے تو بہت کھائے' گھریلو پکوان بھی چکھ کر دیکھتے۔ تفصیل معلوم کی تو پتہ چلا کہ بڑے میاں ایک نواحی گاؤں کے "چودھری" ہیں اور ان کا ڈیرہ شہر سے پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس پر ہمارا اشتیاق اور بڑھا کہ دیہاتی زندگی کی ایک جھلک بھی دیکھنے کو ملے گی۔ ہماری تجویز یہ تھی کہ ایک بڑی ٹیکسی ہم اپنے خرچ سے آمد و رفت کے لئے کرائے پر لے لیتے ہیں لیکن بڑے میاں مان کر نہ دیئے۔ ان کی غیرتِ میزبانی آڑے آ رہی تھی۔ پیلی ٹیکسی میں ان سمیت ہم پانچ آدمی بیٹھ نہیں سکتے تھے جبکہ بڑی ٹیکسی ان کی استطاعت سے باہر تھی اور یہ انہیں منظور نہ تھا کہ کرائے کا جرمانہ مہمانوں پر پڑے۔ وہ ہمیں مقامی بس سروس کے ذریعے اپنے گاؤں لے جانا چاہتے تھے جو گھنٹے بھر بعد روانہ ہونے والی تھی اور ظاہر ہے کہ منزل تک پہنچانے میں بھی زیادہ دیر لگاتی' راستے کے سٹاپ وہ ہمارے لئے چھوڑ تو نہ سکتی تھی۔ ہم نے دو طرفہ سفر اور تناول ماحضر کے لئے درکار وقت کا حساب لگایا تو بڑے میاں کی دعوتِ شیراز ہمیں ٹیڑھی کھیر لگی کیونکہ ان کی میزبانی کا لطف لینے کے بعد ہم اس روز واپس استنبول نہیں پہنچ سکتے تھے جہاں سے اگلے دن ہماری واپسی طے تھی چنانچہ بہ حسرت و یاس ہم نے ان سے معذرت کا فیصلہ کیا اور ہمیں ہی معلوم ہے کہ یہ معذرت کیونکر بڑے میاں سے قبول کرائی گئی۔

ان کی یہ پیشکش ہمیں البتہ منظور کرنی پڑی کہ علو جامع تک وہ ہمارے ساتھ جائیں گے جہاں کی کسی مخصوص دکان کے ایک خاص مشروب سے ہماری تواضع کر کے بڑے میاں ایک حد تک سرخ رُو ہونا چاہتے تھے چنانچہ دو پیلی ٹیکسیوں میں سوار ہو کر علو جامع آئے جو زیادہ دور نہ تھی۔ اس عالی شان مسجد کے قریب پہنچ کر ہم خاصی سیڑھیاں اترنے کے بعد مسجد ہی کے اس حصے میں پہنچے جو اصل میں تو اپنے مخصوص طرزِ تعمیر کے ساتھ ملحقہ مدرسے' ہسپتال اور شاہی لنگر پر مشتمل تھا لیکن اب بازار کا حصہ بن چکا ہے۔ ان سب دکانوں پر چھتوں کی جگہ گنبد تھے جن سے ہماری نظریں استنبول میں ہی مانوس ہو چکی تھیں۔ صدیاں گزرنے کے باوجود بحیثیت مجموعی تعمیر میں کوئی سقم نہیں آیا ہے' یہاں تک کہ چھتیں ٹپکتی تک نہیں ہوں گی ورنہ اتنی قیمتی دکانیں اور عمدہ ریستوران ان میں کیسے سماتے۔ تین جانب درجنوں دکانوں کے یہ سلسلے تھے جن کے سامنے سے ایک (Covered verandah) یعنی مسقف راہداری گزرتی ہے۔ چوتھی طرف سے بڑا زینہ مسجد کے اندر سے اور دو چھوٹے زینے براہ راست مسجد کے دونوں طرف باہر سے وسیع داخلی صحن میں اترتے ہیں جس کے وسط میں چھوٹی سی عمارت پہلے زمانے میں اس کمپلیکس کے دفتر کا کام دیتی ہو گی۔ ان زینوں کے مقابل والی لائن میں موجودہ دکانوں کے تقریباً درمیان ایک صدر دروازہ باہر کی جانب کھلتا ہے جس سے ملحق پہلے بھی بازار ہو گا' اب بھی مارکیٹ ہی کا تسلسل ہے۔ انہی راہداریوں میں گھما پھرا کر ہمارے میزبان بڑے میاں نے ایک صاف ستھری دکان کے سامنے بچھے ہوئے بنچوں پر ہمیں لا بٹھایا اور مشروب کا آرڈر دیا۔

یہاں ہمارا واسطہ جام و سبو سے نہیں پڑا' عام سے کانچ کے بڑے گلاسوں میں جو گاڑھا سا شربت یا پھلوں کا رس یا دونوں کا آمیزہ ہمیں پیش کیا گیا اس کی مہک بھی لاجواب تھی اور ذائقہ بھی بہت خوب۔ یہ واقعی کوئی خاص ہی کسی اَور طرح کا مشروب تھا جس نے ہماری اشتہا کو بیک وقت مٹایا بھی اور مہمیز بھی دی۔ گلاس ختم ہو گئے اور ہم ہونٹ چاٹتے رہ گئے تاہم بڑے میاں کے اصرار کے باوجود ہم نے دوسرا دور چلانے کی ہامی نہ بھری کیونکہ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کوئی سستا نسخہ ہرگز نہیں ہے اور اس کے ساتھ

ہی ... ایں صحبتِ یک ساعت تمام شد ... بڑے میاں بڑی محبت سے معانقے کے بعد ہم سے رخصت ہوئے' دعائیں دیتے گئے اور ہمارے دلوں میں اپنی یاد چھوڑ گئے۔ زندگی کے سفر میں کتنے ہی ایسے بے نام ہمراہیوں سے ملاقات ہوتی ہے جو بس ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آتے اور گزر جاتے ہیں اور بعد میں کبھی یاد بھی آئیں تو کسی حوالے سے ہی یاد آتے ہیں۔ میں نے یہ رودادِ سفر سپردِ قلم نہ کی ہوتی تو اس ترک بوڑھے کی محبت و شفقت کا ذکر بھی کبھی نہ آتا۔

"علو جامع" یعنی مسجدِ اکبر کی پُرشکوہ عمارت ہمارے سامنے تھی۔ اب ہمیں اسی کی طرف رخ کرنا تھا۔ ظہر کی نماز میں مقامی حساب سے کم از کم ایک گھنٹے کی دیر تھی۔ ہم بیرونی زینے سے اوپر چڑھ کر مسجد کے بغلی میدان میں پہنچے جس کی وسعت کو ایک پست قد سنگین چار دیواری نے گھیر رکھا تھا۔ اس پورے میدان میں اسی مٹیالے رنگ کے پتھر کا ہموار اور چمکتا ہوا فرش تھا جس سے اس عظیم مسجد اور کمپلیکس کی تعمیر ہوئی اور جو سامنے نظر آنے والے برصہ کے افق پر حاوی پہاڑی سلسلے ہی سے تراش کر لایا گیا تھا۔ ہمیں وضو اور اس سے پہلے اپنے مثانوں کا بوجھ ہلکا کرنے کی ضرورت تھی۔ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو وضو کا بہت مناسب سا انتظام تو دسترس میں تھا' ٹوائلٹ کے لئے البتہ ایک اشارے کا تعاقب کرنا پڑا جس کی طرف اترنے والی سیڑھی پر ایک کیبن میں ایک نگران کسی اونچی کرسی پر بیٹھا ملا۔ یہاں سے دو ہزار ترکی لیرے کا ٹکٹ لے کر ہی آگے بڑھا جا سکتا تھا۔ آٹھ ہزار لیرے خرچ کر کے ہم پہنچے تو صاف ستھرے بیت الخلاء استعمال کے لئے ملے جن میں پانی کا بھی بہت اچھا اور وافر انتظام تھا۔ یہاں سے فارغ ہو کر وضو کیا اور مسجد میں داخل ہوئے تو ایک فراخ لیکن تقریباً مربع ہال کی وسعت نے ہمارا استقبال کیا جس کی وہی شان اور آن بان تھی جسے استنبول کی تاریخی مساجد نے ہماری آنکھوں کا سرمہ بنا دیا تھا۔

"علو جامع" چودھویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں تعمیر ہوئی گویا وہ چھ صدیوں سے ہماری آمد کی منتظر تھی۔ اس کی چھت بیس گنبدوں سے مل کر بنی ہے جن میں سے تقریباً وسط میں واقع ایک گنبد کی جگہ پہلے کچھ عرصہ خالی رہی اور بعد میں اس پر شیشے سے اسی شکل کا گنبد بنا دیا گیا جس میں سے دھوپ گزر کر مسجد ہال کے خاصے بڑے حصے کو اضافی روشنی بہم پہنچاتی ہے۔ شیشے کے اس گنبد کے نیچے ایک فوارہ اور وضو کے لئے حوض ہے جس نے اس کے پورے زمینی رقبے کو اس طرح گھیر رکھا ہے کہ نمازیوں کا ہجوم زیادہ ہو جانے کی صورت میں وہاں کسی ایک بھی فرد کے لئے نماز ادا کرنے کی گنجائش نہیں نکلتی۔ اس گنبد کا مصدقہ قصہ بھی ایک خاصے کی چیز ہے۔ "علو جامع" کی تعمیر فاتح قسطنطنیہ سلطان محمد ثانی کے والد سلطان مراد ثانی کے زمانے میں ہوئی جو اناطولیہ کی چھوٹی سی عثمانی سلطنت پر برصہ سے حکومت کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے دارالحکومت میں اس تاریخی مسجد اور اس سے ملحقہ تعلیمی و فلاحی عمارات کے لئے یہ قطعۂ زمین پسند کیا جس میں رعایا کے کچھ لوگوں نے اپنے گھر بھی بنا رکھے تھے۔ ان سے یہ گھر اور قطعاتِ زمین خریدے گئے اور منہ مانگی قیمت ادا کر کے سب کو خوش بلکہ خوشحال کر دیا گیا لیکن ایک لاوارث عیسائی بڑھیا آڑ گئی۔ وہ اپنی کٹیا اور تھوڑی سی زمین کسی بڑی سے بڑی قیمت پر بھی فروخت کرنے پر تیار نہ تھی' بالخصوص اس لئے کہ سلطان کے ماہرین تعمیرات کے نقشے کے مطابق اس کی یہ کٹیا اور زمین عین مسجد کے ہال کے اندر آتی تھی۔ بڑھیا کو بالجبر بے دخل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا' تھک ہار کر اسے اس کے حال پر چھوڑ کر چاروں طرف تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا اور ایک درمیانی خلاء کے ساتھ وہ تقریباً مکمل بھی ہو گیا تھا کہ بڑھیا پر وہ وقت آ گیا جو ہر انسان پر آ کے رہتا ہے اور ٹالا نہیں جا سکتا۔

مرتے ہوئے بڑھیا نے اپنے پادری اور بستی کے معتبر عیسائی شہریوں کو بلا کر آخری بات یہ کہی کہ میرے بعد یہ جگہ ظاہر ہے کہ لاوارث ہونے کی وجہ سے حکومت کے قبضے میں چلی جائے گی لیکن سلطان تک میری یہ آخری خواہش ضرور پہنچا دی جائے کہ میری زمین کو مسجد میں شامل کر کے بھی اس کا حصہ نہیں بنایا جائے گا یعنی نہ وہ چھت اس پر ہو گی جو مسجد کو ڈھانپ کر دھوپ سے محروم کر رہی ہے اور نہ میری زمین پر کوئی شخص نماز پڑھے گا۔ بڑھیا کی تدفین کے بعد اس کی وصیت دربار تک پہنچا دی گئی جس پر حرف بہ حرف عملدرآمد کا یہ اہتمام خود سلطان نے کیا تھا جسے چھ سو برس بعد تک برقرار رہتے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئے ہیں۔ بڑھیا کی متروکہ جگہ پر وضو تو کی جا سکتی ہے اور کی بھی جاتی ہے لیکن کوشش کے باوجود بھی کوئی شخص اس میں نماز پڑھنے کی جگہ نہیں بنا سکتا۔ اب یاد نہیں کہ یہ ساری تفصیل مجھے وہیں موقع پر معلوم ہو گئی تھی یا بعد میں کسی ذریعے سے حاصل ہوئی تاہم اس کا پورا اطمینان ہے کہ بیان کردہ حقائق ایک واقعہ کے اجزاء ہیں' کسی کہانی کے پلاٹ کا تانا بانا نہیں۔

ہم جس لمحے مسجد کے ہال میں داخل ہوئے' (یاد ہو گا کہ ترکی کی مساجد مسقف ہال پر ہی مشتمل ہوتی ہیں' ہماری طرح کے برآمدے اور صحن کا وہاں رواج ہی نہیں) اس وقت اذان میں نصف گھنٹہ اور ظہر کی جماعت میں پون گھنٹہ باقی تھا لیکن اس کے باوجود مسجد میں چہل پہل ایسی تھی جو ہمارے ہاں شہروں کی بڑی مساجد تک میں جمعہ کی نماز میں بھی اتنی دیر پہلے دیکھنے میں نہیں آتی۔ بیشتر لوگ باوضو آتے اور جگہ جگہ ستونوں کے ساتھ رکھی ہوئی ریک نما الماریوں میں سے قرآن مجید کے نسخے اٹھا کر پڑھنے بیٹھ جاتے۔ بہت کم تھے جو بڑھیا والے حوض سے وضو کرتے تھے۔ مسجد میں نمازیوں کی آمد کی شرح اور رفتار نے ہمیں متحیر کر دیا۔ یہ منگل کا دن تھا یعنی ہفتے کا ایک عام دن جس میں بالخصوص ظہر اور عصر کی نمازیں خاص مصروفیت کے اوقات میں آتی ہیں لیکن یہاں عالم ہی دوسرا تھا' ہمارے ہاں سے بھی مختلف اور استنبول کی مساجد سے تو بالکل ہی مختلف بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ یہاں جو ترک بستے ہیں' وہ استنبول میں بھی موجود تو ضرور ہوں گے لیکن بڑی حقیر سی اقلیت میں۔

ہم بڑھیا کے حوض کے قریب ہی تحیۃ المسجد کے دو دو نفل پڑھ کر بیٹھ گئے جس کے دوران ہم آس پاس بیٹھے ہوئے سب نمازیوں کا توجہ کا مرکز بنے رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے لوگ کھسکتے کھسکتے ہمارے ساتھ آ لگے اور ہم اپنے ان مسلمان بھائیوں کے بنائے ہوئے نیم دائرے میں محصور ہو کر رہ گئے۔ اب ان کے سوالات کے جوابات عزمے دے رہا تھا جن میں سے پہلا جواب "پاکستان" ہی کافی ثابت ہوتا کیونکہ ہماری وضع قطع تو ویسے ہی ان کی دلچسپی کا وافر سامان رکھتی تھی۔ عزمے کے تعاون سے فائدہ اٹھانے کے بعد ان میں سے ہر شخص از خود ہم سے کسی نہ کسی کے ساتھ براہ راست گفتگو کے لئے بے تاب سا ہو جاتا اور گفتگو تو ظاہر ہے کہ اشاروں میں ہی ہو سکتی تھی۔ مثلاً مجھ پر ایک شخص نے سوال داغا "مذہب" اور میں نے "حنفی" کہا تو وہ نہال ہو گیا۔ پھر ہاتھ کو سوال کی سی حرکت دے کر اس نے پوچھا "مسلک" تو میں سمجھ گیا کہ وہ کس جواب کا متمنی ہے چنانچہ کہا "نقشبندی" تو اب اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا' اس نے آس پاس بیٹھے اپنے ساتھیوں کو بھی بڑے فخر سے اپنی اس

"دریافت" میں شریک کیا اور سبھی چہرے کھل گئے۔
اتنے میں اذان کی آواز بلند ہوئی اور ہم نے خاموش ہو کر اس کا جواب دینا شروع کیا تو ہمارے گرد موجود بھیڑ بھی چھٹنے لگی۔ اگرچہ اس کی وجہ سے ہم مسجد کے پورے ہال میں نمایاں ہو گئے اور لوگ دور دور تک گردنیں موڑ کر ہمیں نظر بھر کر دیکھتے پائے گئے۔

اذان اور اس کے بعد موذن کی طرف سے ساؤنڈ سسٹم پر ہی پڑھی گئی مسنون دعا کے خاتمے تک مسجد قریباً بھر چکی تھی۔ بالکل ویسے ہی جیسے جمعہ کی نماز کے لئے ہمارے ہاں کی مساجد اذان ثانی کے بعد یعنی عربی خطبہ کے دوران بھری پُری نظر آتی ہیں۔ میں نے حساب لگایا تو نمازیوں کی تعداد ڈھائی ہزار اور تین ہزار کے درمیان تھی (اور میرا یہ حساب کتاب اپنے انجینئرنگ کے پس منظر اور تجربے کی بنا پر کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا)۔ اب سب نمازی پورے اہتمام سے چار سنتوں کی نیت باندھ رہے تھے۔ ہمارے ان اہلِ سنت والجماعت ترک بھائیوں کے ہاں بھی ہر درجے کی سنتیں بلکہ بہ التزام بیٹھ کر پڑھے جانے والے نفل بھی نماز کا اضافی یا اختیاری حصہ نہیں بلکہ "فرض" سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم یہ سنتیں ہم پر "فرض" نہ تھیں کیونکہ مسافرت در مسافرت کی رخصت ہمیں میسر تھی لیکن اس کے باوجود ہم نے بھی انہیں پڑھنے کا فیصلہ کیا کہ ثواب سے تو بہرحال یہ ہمارے لئے بھی خالی نہ تھیں اور برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے کیا سوچا' وہ جانیں' مجھے خیال آیا کہ یہ سنتیں چھوڑ دیں تو میری "حنفیت و نقشبندیت" پر حرف آئے گا۔

میں نے صفِ اول کی طرف بڑھنا شروع کیا جس کے لئے درمیانی صفوں میں سے لوگوں نے مجھے خندہ پیشانی کے ساتھ راستہ دیا اور پھر یہ سوچ کر کہ پہلی صف ان بزرگ نمازیوں کے لئے چھوڑ دوں جن میں سے اکثر سنتوں سے فارغ ہو کر لکڑی سے بنے ہوئے عظیم الجثہ منبر کے ساتھ ٹیک لگائے تسبیح پھیر رہے ہیں' دوسری صف میں کھڑا ہو کر تکبیر اولیٰ کہنے کے لئے ہاتھ اٹھانے ہی والا تھا کہ ایک بوڑھے کی ششکاری نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ پہلی صف میں منبر کے قریب اس جگہ سے جہاں خود بیٹھا ہوا تھا' دو تین فٹ کے فاصلے پر اپنی ہتھیلی زور زور سے فرشی قالین پر مار کر گویا کہہ رہا تھا کہ یہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھو۔ میں نے یہ اشارہ سمجھ کر ان کی فرمائش پوری کرنے کے لئے قدم بڑھایا تو بڑے میاں نے خوشنودی کا اظہار کیا۔ چار رکعت نماز سے فارغ ہو کر میں نے سلام پھیرا اور ان بڑے میاں کی طرف متوجہ ہوا جو اسی انتظار میں تھے تو انہوں نے سوالیہ انداز میں سر کو جھٹکا دیتے ہوئے گویا تصدیق چاہی --- "پاکستان"---- اور جب میں نے کہا کہ "الحمدللہ' پاکستان" تو فاتحانہ مسرت کے ساتھ بڑے میاں نے میرے سامنے اسی جگہ ہاتھ رکھنے کے بعد جہاں سجدے میں میری پیشانی آئی ہوگی' پہلے تو سینے پر ہاتھ باندھے جیسے نماز کے لئے باندھے جاتے ہیں اور پھر کہا۔ "ضیاء الحق"۔ یعنی تمہارے مرحوم صدر ضیاء الحق نے جب برصہ میں یہ مسجد دیکھی تو عین اسی جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھی تھی۔ بڑے میاں نے زبان سے صرف دو الفاظ ادا کئے لیکن اپنی بات کی پوری تفصیل مجھے سمجھا دی۔ مرحوم صدر کے ساتھ ترکی کے اس دورے میں شریک بہت سے لوگ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہوں گے جس میں انہوں نے برصہ کا چکر بھی لگایا۔ وہ تصدیق کریں گے کہ میں نے بڑے میاں کی بات کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔

فرض نماز اختتام کو پہنچی تو ہم نے تسبیح فاطمہؓ پڑھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو تلاش کر لیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس قرارداد پر اتفاق رائے ہو گیا کہ طویل دعا کا انتظار کئے بغیر ہم کھسک چلیں گے۔ چنانچہ لوگوں کے ہاتھ دعا کے لئے اٹھے ہوئے تھے کہ ہم نے صفیں چیرتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔ نمازیوں کے چہرے پر حیرت اور قدرے ناگواری کے ملے جلے تاثرات تو ضرور تھے لیکن ہمیں راستہ دینے میں انہوں نے ذرا بھی پس و پیش نہ کیا۔ فرضوں کے بعد کی سنتیں اور نوافل ان کے لئے "فرض" کا درجہ رکھتے تھے لیکن بہت سے بھائیوں کو یہ بھی یاد ہوگا کہ مسافروں کے لئے ان کا اہتمام ضروری نہیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو' ہمارا واسطہ کسی ایسے صاحب سے نہیں پڑا جیسے ایک معترض سے سمن آباد لاہور کی مسجد میں ہمارے دوست کی مڈھ بھیڑ ہوئی تھی۔ وہ مغرب کی جماعت کے بعد دو سنتیں ادا کر کے مسجد سے نکل آیا کرتے تھے۔ جنابِ معترض طبیعت پر جبر کر کے کئی دن یہ تماشا دیکھا کئے لیکن آخر ایک دن ان سے صبر نہ ہو سکا۔ جلدی سے اپنے دوگانہ نفل پڑھ کر وہ بھی باہر آ گئے اور ہمارے دوست کو آ لیا۔ "میں نے کہا جناب' ذرا میری عرض سنیں گے!۔ یہ نفل آپ پر فرض نہیں ہیں؟"۔

ہم مسجد کے بغلی میدان میں آئے تو وہ جگہ جو پہلے خالی تھی' ریڑھیوں اور خوانچوں سے بھری پڑی تھی جن میں سے اکثر پر اشیائے خورد و نوش برائے فروخت تھیں۔ روٹیوں کی کئی قسمیں' پھل' اچار اور مربے' سلاد کے لئے تازہ سبزیاں' پنیر' دہی کے ڈبے اور سبز و سیاہ زیتون سے بھری ان ریڑھیوں پر ذرا دیر بعد نمازیوں کا ہجوم ہو جائے گا۔ ہم ان چیزوں کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ نمازی برآمد ہونے لگے۔ آخر طوفان میل کی رفتار سے رکعتوں کی مسافت طے کرنے والے بھی تو ان لوگوں میں شامل تھے ہی۔ ان بھائیوں میں سے بہت سے خریداری کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ بھی کم نہ تھے جنہوں نے ہم سے مصافحہ کرنے کو خریداری پر ترجیح دی۔ ہمارے یہ محبت کرنے والے ترک بھائی اس آدم بیزار آبادی سے کتنے مختلف ہیں جس میں استنبول کے قیام کے دوران ہمارے چھ دن گزرے۔ ان کا بھی لباس تو نیم مغربی ہے لیکن انداز میں وہ مشرقیت اور گرمجوشی پائی جاتی ہے جسے جدید تر ترکی میں ہم ترس گئے تھے۔

برادر محترم کی یہ صراحت بالکل درست معلوم ہوئی کہ استنبول پر سیاحت کی صنعت اور جغرافیائی قرب کی وجہ سے یورپ کا اثر زیادہ ہے اور ویسے بھی اس عظیم شہر کی آبادی کا بڑا حصہ سلطنت عثمانیہ کے ان یورپی مقبوضات سے آ کر یہاں بس جانے والوں پر مشتمل ہے جو ترکانِ عثمانی کے دورِ عروج میں رضاکارانہ خود آئے یا سرکاری طور پر یہاں لائے گئے اور اسلام قبول کر کے مقامی معاشرے میں جذب ہو گئے۔ ان کا یہ کہنا بھی صائب تھا کہ استنبول میں تو نجیب الطرفین ترک تلاش کرنے سے ہی مل سکتے ہیں کیونکہ وہاں تو اکثریت "دوغلوں" کی ہے۔ بہرحال ہم اصل ترکوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ جنوب اور مشرق کی طرف اس برادر ملک کی گہرائی میں کچھ اور اترنے کا موقعہ ملتا تو ترکانِ عثمانی کی ان باقیات سے بھی واسطہ پڑتا جنہوں نے پانچ صدیاں خلافت کا علم بلند رکھا اور گویا پورے کرۂ ارضی پر اسلام کا بھرم بھی قائم رکھا تھا۔ اس کی فرصت میسر ہوتی تو ہمارے سوکھے دھانوں میں کچھ زیادہ پانی پڑتا لیکن یہ تو ہم بہرطور جانتے ہیں کہ ایک ارب سے زیادہ مسلمان جن میں ایمان و اسلام کے ہر درجے سے تعلق رکھنے والے پائے جاتے ہیں' دنیا کی تقدیر بدلنے پر کیا' اپنی اوقات بھی بہتر بنا سکنے کے قابل نہیں تو اس لئے کہ ہم نے اس رسی کا سرا ہاتھ سے چھوڑ دیا ہے جو "حبل اللہ المتین" ہے اور جو ہمارا رشتہ اپنے رب' احکم الحاکمین

سے جوڑتی ہے حالانکہ اسے بالکل اصل شکل میں آج بھی ہمارے گھر میں چوم چاٹ کے رکھا جاتا ہے لیکن ہاں' طاق نسیاں پر۔ ہمارے بزرگوں نے جس شمشیر سے اپنے اندر کے شیطان کو تہ تیغ کیا اور پھر اسی کو باطل کی ہر نوع کو حرفِ غلط کی طرح مٹا ڈالنے کے لئے استعمال کیا تھا' وہ ہماری نیام میں پڑی زنگ کھا رہی ہے۔ "وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر--- اور ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر"۔

مسلمانوں کی پامالی پر میرے محترم بھائی کے غم و اندوہ میں ۱۹۸۰ء کی دہائی کے دوران کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ اکثر حسرت سے کہا کرتے ہیں کہ اہلِ تشیع نے تو اپنے تصورات کے مطابق ہی سہی' ایک ریاست کا ڈھانچہ زمین پر کھڑا کر کے دکھا دیا' ہمارے سُنّی بھائی بالکل ہی "سُنّ" ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا تاثر یہ ہے (جسے وہ علمی زبان میں بیان کرتے ہوئے بہت محتاط الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن میں اس درجے احتیاط کا مکلف نہیں ہوں کہ اپنی زبان میں ایک کیفیت کا ذکر کر رہا ہوں) کہ اول تو اہلِ سنت کی فقہ نے ہمارے قویٰ کو شل کر دیا ہے جو چونکہ دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئی تھی لہٰذا اسلام کو بدنام کرنے والے حکمرانوں کے خلاف جدوجہد تک کو بھی اس میں ناممکن الوقوع قسم کی شرائط سے مشروط کر کے عملاً متروک قرار دے دیا گیا جس کے باعث لوگوں کی کھال موٹی ہوتی چلی گئی اور وہ سب کچھ دیکھتے بھالتے بلکہ بھگتتے ہوئے بھی برداشت کرتے چلے جانے کے عادی ہو گئے۔ اور پھر رہی سہی کسر تصوف کے سلسلوں نے پوری کر دی جن کے زیرِ اثر مسلمانوں نے غیر اسلام بلکہ عریاں باطل کے دل میں بھی کانٹے کی طرح کھٹکنا چھوڑ دیا اور سارا زور "اللہ ھُو" کی ضربوں پر لگایا جانے لگا۔ ان کے ایمان و اسلام کو پھر سے ایک فعال و متحرک قوت بنانا اب خالہ جی کا گھر نہیں رہا۔○○

(باقی باقی)۔

بقیہ : حدیثِ امروز

قرآن حکیم نے قدم بقدم ان کی رہنمائی کی تھی۔ وہ نسخہ' کیمیا بھی ہمارے پاس حرف بحرف جوں کا توں موجود ہے جس کی تاثیر نے یہ معجز نمائی ممکن العمل کی اور اس راہ کے ہر مرحلے کی تفصیل بھی سیرتِ مطہرہ اور آثارِ صحابہ میں پوری طرح محفوظ' جو نشاطِ منزل سے ہمکناری کا ذریعہ بنی۔ دین کے غلبہ کی یہ جدوجہد ابد تک ہر اس گروہ کے لئے مثال کا کام دیتی رہے گی جو اقامت دین کو اپنا مقصد بنا لے اور اس میں اختیار کیا گیا طریقہ کار ہی وہ منہج ہے جس کا اتباع اس گروہ کو کرنا ہو گا ورنہ سعی و جہد اسی طرح رائیگاں ہو گی جیسے رائیگاں ہوتے ہم دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ رضائے الٰہی اور نجاتِ اخروی کے حصول کی غرض سے اقامتِ دین کو "فرض" مان لینے والے بھی منہج انقلاب نبوی" کی "سنت" کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جس میں عصری تقاضوں کے تحت اجتہاد کی ضرورت تو ہے لیکن بس ایک حد تک۔ اس سے اغماض کے بعد اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے وہ معاصر تحریکوں کے طریق کار سے استفادے پر مجبور ہو جاتے ہیں جن کی قدریں مختلف ہیں اور اہداف بہت ہی محدود۔ اس تناظر میں دیکھیں تو ہم پر اللہ تعالیٰ نے خصوصی فضل فرمایا کہ دورِ حاضر میں مسنون منہج انقلاب کے مراحل پر انشراحِ صدر حاصل ہو گیا ہے۔ اب ہمارا کام ہے کہ اسے دنیا بھر کے ان مخلص مسلمانوں تک دلیل و برہان کے ساتھ پہنچائیں جن کے عزائم کو اللہ تعالیٰ نے سینوں میں بیدار کر دیا ہے۔ اس میں کم کوشی اور کاہلی کی گنجائش نہیں۔ وقتِ فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے۔ لیکن ہمیں اپنے اس کام کی اہمیت کا احساس بھی ہے؟۔○○

بقیہ : پریس ریلیز

مشاورت نے محدود علاقے میں نفاذ شریعت کے مطالبے کو بھی حکمت کے خلاف قرار دیا اور تحریک نفاذ شریعت کو مشورہ دیا ہے کہ مطالبہ پورے ملک میں تبدیلی کا کیا جائے جو پاکستان کے تمام دینی حلقوں کی قوت کو ان کی پشت پر لا کر کھڑا کر سکتا ہے اور ایسی ہی کسی متفقہ و متحدہ تحریک مزاحمت کے ذریعے ملک کے حق میں کوئی خیر برآمد ہو گا۔○○

بقیہ : مذاہب و مسالک

آج میڈیا نے دنیا کو سمیٹ کر ایک دوسرے کے انتہائی قریب کر دیا ہے۔ ہوائی سفر آواز سے تیز رفتار سے طے ہونے لگا ہے۔ فکری اعتبار سے بنی نوع انسان نے بالیدگی حاصل کی ہے۔ لیکن مسلم دنیا ہنوز الگ الگ خانوں اور گوشوں میں بٹی ہوئی ہے۔ مسلمان علماء اور زعماء کو عالمی پیمانے پر اعلیٰ سطحی رابطے کا کوئی ذریعہ تلاش کرنا چاہئے۔

جدید دور کی اسلامی ریاست کا نقشہ کیا ہو گا اور اسے وجود میں لانے کے لئے کیا طریقہ کار ہو' اس پر مفصل گفتگو ہونی چاہئے اور کوئی واضح اور دو ٹوک لائحہ عمل سامنے آنا چاہئے اور اس کے مطابق کسی عملی جدوجہد کا آغاز کیا جانا چاہئے۔ ورنہ جیسا کہ ہم نے ماضی کے حالات کا مطالعہ کیا ہے ہمارا اب تک سارا زور بحث مباحثوں پر رہا جس کا الٹا مغرب نے فائدہ اٹھایا۔ مسلم دنیا میں موجود کسی ایسے ملک پر ساری توجہ مرکوز کر دینی چاہئے جہاں سب سے زیادہ تبدیلی کے امکانات موجود ہوں اور وہ ملک اسلامی ریاست بننے کی صورت میں امت مسلمہ کو موجودہ ابتری اور زبوں حالی سے نکالنے کے لئے مستقبل میں موثر کردار ادا کر سکتا ہو۔ اسلام ایک دین ہے محض ایک نظریہ یا مذہب نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی اصل حقیقت اس وقت تک سامنے آ ہی نہیں سکتی جب تک ریاستی سطح پر اس کا عملی نمونہ پیش نہ کیا جائے' جو لوگ ذاتی نیکی اور تقویٰ کو ہی اسلام سمجھے ہوئے ہیں انہیں باور کرانا ہو گا کہ یہ اسلام کا ابتدائی مرحلہ تو ہے' کل اسلام نہیں ہے اور جزوی اسلام درحقیقت اسلام کی نفی ہے۔ مکمل اسلام کا مطلب ہے' مکمل غلبہ دین۔ البتہ انفرادی طور پر غلبہ دین کی جدوجہد کا مقصد فقط رضائے الٰہی اور نجات اخروی ہی ہے۔ بالفعل غلبہ دین شرط لازم نہیں ہے اس کے لئے جدوجہد لازم ہے۔

بقیہ : جسٹس چیمہ کا انٹرویو

عرض کیا کہ ہر حلقے میں مسلم لیگ کے سامنے پیپلز پارٹی تو موجود ہے ہی آپ کا امیدوار بھی مقابلے میں کھڑا ہے۔ لامحالہ اسلام پسند ووٹ تقسیم ہو گا اور مسلم لیگ کی ناکامی کی ذمہ داری براہ راست آپ پر آئے گی۔ پروفیسر خورشید صاحب خاموش ہو گئے۔ بعد میں میرے بیٹے نے کہا کہ ابا جان آپ نے خلاف معمول بڑا سخت لہجہ اختیار کیا تھا۔ میں نے کہا میرا دل دکھا ہوا تھا۔ بے ساختہ جو جی میں آیا کہتا چلا گیا۔ مولانا مودودی کی فکر حکیمانہ اور گہری تھی۔ جماعت اسلامی عورت کی سربراہی کے بارے میں وہی نقطہ نظر رکھتی ہے جو جمہور علماء کا ہے لیکن فیلڈ مارشل ایوب خان کے مقابلے میں مولانا مودودی نے اھون البلیتین کے اصول پر وسیع تر قومی مفاد کے لئے مادر ملت کی حمایت کی۔ انہوں نے اسلام کے روایتی اصول "کم تر برائی" کو اپنایا۔ ہم نواز شریف کو مثالی حکمران نہیں سمجھتے۔ چیف منسٹر پنجاب کی حیثیت سے اور وزیر اعظم کی حیثیت سے بھی ان کے دور کو مثالی قرار نہیں دیا جا سکتا لیکن ملک کا درد رکھنے والا ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ وقت کی ضرورت کیا ہے۔ ایسی صورت حال میں قاضی حسین احمد کا رول بڑا تکلیف دہ ہے۔

اپنے وطن میں سب کچھ ہے پیارے

سردار اعوان

حکومت اور اپوزیشن میں اختلاف آخر ہے کیا؟

دونوں سیاحی دھڑوں میں ہم آہنگی اور موافقت موجود تو ہے!

صدر صاحب ایک تجربہ کار اور باصلاحیت شخص کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ وہ ہر بات سوچ سمجھ اور ناپ تول کر کرتے ہیں اور کوئی بھی شخص ان کی بات بڑی آسانی سے سمجھ جاتا ہے لیکن پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے ان کا خطاب (۱۴ نومبر)' جس میں انہوں نے حکومت اور اپوزیشن کو اپنے اختلافات ختم کر کے موافقت اور ہم آہنگی پیدا کرنے کا مشورہ دیا ہے' سمجھ سے بالاتر ہے۔ حیرت ہے کہ دونوں سیاسی دھڑوں کے درمیان اتنی بڑی جو موافقت اور ہم آہنگی پہلے ہی موجود ہے' صدر صاحب کو وہ سرے سے نظر نہیں آئی۔

کشمیر کی مثال ہی لے لیں۔ دونوں دھڑے آزادی کی یہ جنگ اس وقت تک لڑنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں جب تک ایک کشمیری بھی باقی ہے۔ دونوں قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ آخری ایٹم فروخت ہونے تک بم کی حفاظت کریں گے۔ منشیات کے کاروبار میں ملوث افراد کو دونوں ہی امریکہ کے حوالے کرنے پر راضی ہیں' سوائے اپنے آدمیوں کے۔ دونوں نے غربت کے خاتمے کا عہد کر رکھا ہے جس کی بہترین مثال بلاول ہاؤس اور اتفاق خاندان ہیں۔ کمیشن کی خاطر قومی ترقی کو دونوں ضروری سمجھتے ہیں البتہ دو مسئلے ایسے ہیں جو تاحال مکمل اتفاق رائے سے محروم نظر آتے ہیں' یعنی ایک جمہوریت اور دوسرا احتساب کا مسئلہ۔ اگرچہ بنیادی طور پر ان کے بارے میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ مثلاً دونوں مانتے ہیں کہ جمہوریت اچھی شے ہے اور یہ بھی کہ اسے خطرہ ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اسی طرح دونوں میں سے کوئی بھی احتساب کی ضرورت اور اہمیت کا انکار نہیں کرتا' مگر ہر فریق چاہتا ہے کہ احتساب کا عمل مخالف فریق سے شروع ہو اور اسی پر ختم ہو جائے۔

اب اگر اس جزوی اختلاف کو چھوڑ کر باقی تمام معاملات میں گہری موافقت موجود ہے تو کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں جمہوریت کو فروغ حاصل نہیں ہو رہا اور یہ بھی تو دیکھیں کہ دونوں جانب سے باقی ماندہ اختلافات کو بھی دور کرنے کے لئے کون سی کسر اٹھا رکھی جا رہی ہے۔ دی نیوز (۱۵/ نومبر کے صفحہ آخر پر وہ تصویر آپ کی نظروں سے گزری ہو گی جس میں تہمینہ دولتانہ (پی۔ ایم۔ ایل) اور شہزادی کوثر (پی۔ پی۔ پی) کو اسی طرح کی ایک کوشش کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ دونوں طرف کے مرد اس ذمہ داری کو جس بھرپور انداز میں مردانہ وار پورا کر رہے ہیں اسے دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اگلے انتخابات میں امیدواروں کی جسمانی صحت کی ضرورت پر سارا زور ہی مضبوط اور توانا بنا دی گئی ہے جتنی کہ مغرب میں ہے۔ جمہوریت کے شائقین کے لئے یہ بڑی خوشی کا مقام ہے کیونکہ اگلے انتخابات میں "نیا خون" پارلیمنٹ میں شامل ہونے پر ہم مغرب کو پیچھے چھوڑ جائیں گے۔

معلوم ہوتا ہے سیاست کے میدان میں بے نظیر بھٹو' نواز شریف کی صحیح مدمقابل ہیں اور جمہوریت کو اس مقام تک پہنچانے میں دونوں کی خدمات ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں۔ البتہ اتنے کم وقت میں ان دونوں کو اتنی بڑی کامیابی ہرگز حاصل نہ ہوتی اگر فوج کی "غیر جانبداری" ان کے شامل حال نہ ہوتی۔ اس کے لئے پاکستان کی فوج بجا طور پر قوم کے شکریے کی مستحق ہے۔ بہرحال موجودہ جمہوریت کو اگر قائم رکھنا ہو گا۔ ویسے پارلیمنٹ کے اندر نئی روایات قائم کرنے اور انہیں بارونق اور جاندار بنانے میں بے نظیر بھٹو صاحبہ کا خاصا بڑا رول ہے۔ چنانچہ صدر کے خطاب کے دوران قومی اسمبلی میں ہونے والی دھینگا مشتی کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ اپوزیشن کے صدر اور وزیر اعظم پر حملوں کو ناکام بنا کر پیپلز پارٹی نے فتح حاصل کر لی ہے۔ انہوں نے اطالوی پارلیمنٹ میں ہونے والے دنگا فساد سے موازنہ کرتے ہوئے اس پر اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ پاکستان میں جمہوریت اتنی ہے تو اس روایت کو توڑنا ہو گا کہ لوٹ کا حق صرف حکومت کو ہی حاصل ہے اور "کچھ لو اور کچھ دو" کے اصول پر عمل کرنا ہو گا۔ اپوزیشن کو کمیشن میں شریک کئے بغیر اعتماد میں لینے کی باتیں نرا ڈھونگ ہیں۔ صدر صاحب نے جس موافقت اور ہم آہنگی پر زور دیا ہے' اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ جہاں تک مصائب میں مبتلا' غموں کے مارے عوام کا معاملہ ہے' انہیں خوبصورت ترانے سنائیں ع "پاک سرزمین شاد باد"

گھر ہی کی تو بات ہے!

بیشتر عرب ممالک کی طرح شام میں انتقال اقتدار گھر کا معاملہ ہوتا ہے۔ چھیاسٹھ سالہ حافظ الاسد ذیابیطس اور دل کے مریض ہیں۔ ان کے بعد ان کے بیٹے باسل اسد گدی سنبھالنے والے تھے مگر بدقسمتی سے وہ گذشتہ جنوری کو کار کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ اب اسد اپنے دوسرے بیٹے' انتیس سالہ بشیر کو اپنے جانشین کے طور پر آگے لائے ہیں۔ بشیر لندن میں امراض چشم کے علاج کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ حافظ الاسد نے اسے چند ماہ قبل واپس بلا کر فوج میں میجر کے عہدہ پر تعینات کیا ہے۔

حافظ الاسد کی خاندانی بادشاہت قائم کرنے کی ان کوششوں کے خلاف ان لوگوں نے خاص طور پر اپنا ردعمل ظاہر کیا ہے جو ان کے بعد اقتدار میں آنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور جنہیں اس فیصلے سے اپنی امیدیں خاک میں ملتی نظر آ رہی ہیں۔ اگست میں شام کے سیکورٹی کے ایک اعلیٰ افسر اور متعدد چوٹی کے جرنیلوں کی برطرفی بھی اسی سلسلے کی کڑی نظر آتے ہیں۔ اگرچہ کہا یہ گیا ہے کہ یہ لوگ اسرائیل کے ساتھ امن مذاکرات کے مخالف تھے۔

بشیر کے معاملے میں ایک دستوری رکاوٹ بھی پیش آ سکتی ہے کیونکہ آئینی طور پر صدر کے لئے چالیس سال کی عمر کا ہونا لازمی ہے۔ اس پر لوگ مذاق میں کہہ رہے ہیں کہ بڑے اسد کو تین میں سے کوئی ایک راہ اختیار کرنا پڑے گی۔ آئین میں تبدیلی کریں' اپنے لئے مزید گیارہ سال کی مہلت اللہ میاں سے حاصل کر لیں (تب تک بشر چالیس سال کے ہو جائیں) یا صاحبزادے کی عمر تبدیل کر دیں۔○○

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

مہاجروں کو علیحدہ صوبہ نہ دیا گیا تو ملک ایک اور المیہ سے دوچار ہو گا

آج پھر وہی حالات ہیں جن میں ملک دولخت ہوا تھا لیکن حکمران اب بھی سنجیدہ نہیں

تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلسِ مشاورت کے اجلاس نے ملک کی سیاسی صورت حال کو تشویشناک قرار دیا

لاہور۔ ۳۰ / دسمبر: ۔ امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد کی صدارت میں تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت کا دو روزہ اجلاس جماعتی امور اور ملک کی سیاسی صورت حال کے جائزے کے بعد آج اختتام کو پہنچا جس میں قومی سیاسی منظر کو تشویشناک قرار دیا گیا ہے۔ سندھ اور بالخصوص کراچی کے حالات و واقعات کے حوالے سے مجلس کی رائے میں پاکستان ایک بار پھر اسی نازک موڑ تک جا پہنچا ہے جس پر ۱۹۷۱ء میں کھڑا تھا اور المناک سانحہ یہ ہے کہ حیرت انگیز مماثلت کے مشاہدے کے باوجود وہی غلطیاں پھر دوہرائی جا رہی ہیں جن کے نتیجے میں ملک دولخت ہوا تھا۔ اپنے ازلی دشمن بھارت کو ہم نے کھلا موقع دیا کہ یہاں بھی ہمارے باہمی نفاق سے اسی طرح فائدہ اٹھائے جیسے مشرقی پاکستان میں اٹھا چکا ہے اور کراچی میں بھارتی قنصل خانے کو بند کرنے کا فیصلہ کرنے میں بہت تاخیر کی گئی ہے۔ تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت نے محسوس کیا کہ اگرچہ بظاہر حکومت اب ایم کیو ایم سے مذاکرات کا آغاز کر چکی ہے تاہم اندیشہ ہے کہ ایم کیو ایم کی دھڑے بندی سے فائدہ اٹھا کر معاملات کے تصفیہ کو ٹالا جائے گا اور کراچی میں آبادی کے اس طبقے کو کھلونے دے کر بہلانے کی کوشش ہوگی جو مہاجرین کے نام سے پہچانا جاتا ہے جبکہ اس کا فعال حصہ پوری بے باکی سے اپنے اس فیصلے کا اعلان کر رہا ہے کہ "اب یا پھر کبھی نہیں"۔ کراچی میں پاکستان سے علیحدگی کی باتیں اب عریاں الفاظ میں کی جانے لگی ہیں اور یہ شاید آخری موقع ہے کہ ایک علیحدہ صوبہ دے کر مہاجرین کو ملک سے کٹ جانے سے روک لیا جائے جبکہ غیر ضروری تاخیر شاید اس حل کو بھی اسی طرح غیر موثر بنا کر رکھ دے گی جیسے مشرقی پاکستان میں ازیت ناک علیحدگی کے سوا ہر حل غیر موثر ہو گیا تھا۔

تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت نے محب وطن پاکستانیوں کو یاد دلایا کہ صوبوں کی نئی حد بندی اور ملک کو چھوٹے انتظامی یونٹوں میں تقسیم کرنے کی بات سب سے پہلے تنظیم اسلامی کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے تحریک خلافت پاکستان کے پلیٹ فارم سے کی اور دلیل و برہان سے ثابت کیا تھا کہ ملک خداداد کے استحکام کی کلید تو اسلام کا واقعی اور حقیقی نفاذ یعنی نظام خلافت کا قیام ہے تاہم آبادی کے مختلف طبقات میں مسلسل بڑھتی چلی جانے والی منافرت کا فوری اور وقتی علاج اس کے سوا کوئی اور نہیں کہ سندھ ہی کو نہیں بلکہ چاروں صوبوں کو تقریباً ایک ایک کروڑ آبادی پر مشتمل نئے صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اس تقسیم میں لسانی، تہذیبی اور علاقائی حوالوں کو بھی مناسب اہمیت دی جائے تاکہ اپنے معاملات کو سنبھالنے کا موقع حاصل کر کے لوگوں میں خود اعتمادی کے علاوہ وفاق اور دوسرے صوبوں سے تعاون اور اشتراک عمل کی ضرورت کا احساس بھی جڑ پکڑ سکے۔ ماضی میں اس تجویز پر مخالفانہ ردعمل کا اظہار ہوا تھا لیکن اب سوچنے سمجھنے والا ہر وہ سیاستدان اپنے الفاظ میں یہی بات کہنے پر مجبور ہو گیا ہے جس کی ترجیحات میں ملک کی جغرافیائی سالمیت کو اولیت حاصل ہے۔ بحالات موجودہ اس تجویز کی سب سے تیز و تند مخالفت پرانے سندھیوں کی طرف سے متوقع ہے اور پیپلزپارٹی کو اب اصل امتحان یہی درپیش ہے کہ بچے کھچے پاکستان کو نیو ورلڈ آرڈر کے مذموم منصوبوں کے تحت مزید شکست و ریخت سے بچانے میں کوئی مثبت کردار ادا کر سکتی ہے یا نہیں کیونکہ وہ سندھ کی حقیقی نمائندگی کی دعویدار ہے۔

تنظیم اسلامی کی مرکزی مجلس مشاورت نے شمالی علاقہ جات کے بعض حصوں میں نفاذ شریعت محمدی کی تحریک کے مسلح بغاوت کی شکل اختیار کر لینے اور بعد کے واقعات پر بھی غور کیا اور اس رائے پر پہنچی کہ حالات کی یہ نازک صورت حکومت کی غلط حکمت عملی اور وعدوں کی مسلسل خلاف ورزی نے پیدا کی تھی اور اب بھی ذمہ داران حکومت مسئلہ کے حل میں سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کر رہے جس کے نتیجے میں یہ تحریک شرپسندوں کے ہاتھوں میں جا کر پہلے سے بڑے اتلاف مال و جان کا باعث بن سکتی ہے لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ صوبائی اور مرکزی حکومتیں عقل کے ناخن لیں اور تحریک کے سنجیدہ اور مخلص قائدین کو اعتماد میں لے کر اصل مسائل کے قابل عمل اور

تحریکِ نفاذِ شریعتِ محمدیؐ کو تین مشورے بھی دیئے گئے

قابل قبول حل پر اتفاق رائے کے بعد اس پر پوری دیانت داری سے عملدرامد کا اہتمام کریں۔ مجلس مشاورت نے تحریک نفاذ شریعت محمدی سے بھی کہا ہے کہ حال ہی میں اپنے قیدیوں کی رہائی میں پرامن مظاہرے اور دھرنا مار کر بیٹھنے کے ذریعے اس نے جو کامیابی حاصل کی ہے اسے مشعل راہ بنایا جائے اور آئندہ تعمیری مقاصد کے لئے منظم مزاحمت کے انہی پرامن طریقوں سے کام لیا جائے جس کی وکالت تنظیم اسلامی اپنی تاسیس کے اول روز سے کر رہی ہے۔ تحریک پر یہ بھی واضح کیا گیا کہ اس کا ہدف شریعت کا نفاذ نہیں بلکہ اسلامی نظام یا نظام خلافت کا قیام ہونا چاہئے۔ موجودہ باطل و فاسد نظام کو بدلے بغیر اسلامی شریعت کا نفاذ موثر ہو گا اور نہ اس سے مطلوبہ نتائج حاصل ہو سکیں گے کیونکہ کوئی شریعت تو نام ہی کسی مخصوص نظام کو کامیابی سے چلانے کے قواعد و ضوابط کے مجموعے کا ہوتی ہے۔ تنظیم اسلامی کی مجلس

(باقی صفحہ ۲۲ پر)